شعلہ و شبنم

جوش
(ملیح آبادی)

تعداد ـــــــــــ تین سو
قیمت ـــــــــــ بیس روپے
مطبوعہ ـــــــــــ خواجہ پریس دہلیؔ
حُسن کار ـــــــــــ انتظار احمد
طباعت ٹائیٹل ـــــــــــ جلال پریس دہلی
ناشر ـــــــــــ ہمالیہ بک ہاؤس
۲۷۶۲ - گلی چاندی والی، دہلیؔ

اے روحِ عنبر حامزد ہندوستانِ نو
لایا ہے اک صحیفہ، سخنداں ترے لئے
اس مصحفِ عظیم کی الٹدری وسعتیں ا
ہر بہ ہے مشرقین بدا ماں ترے لئے
ہر منظرِ حیات کو دیکھا ہے غور سے
چھوڑا نہیں ہے ایک بھی عنواں ترے لئے
رکتی ہے جس مقام پہ روح الامین کی سانس
دل کو وہاں کیا ہے پر افشاں ترے لئے
لایا ہوں بزم و رزم کی ارض تضاد سے
یہ طبلِ جنگ و سازِ سبستاں ترے لئے
کتنی شبوں کے طاق میں رکھ کر چراغِ دل
پرکھی ہے روحِ عالمِ امکاں ترے لئے
اس کی خبر بھی ہے کہ بنایا گیا ہے لحن
کتنی شبوں کا گریہ پنہاں ترے لئے
ڈھالے ہیں مرغزارِ گلستاں کی شکل میں
کتنے مہیب و تیرہ بیاباں ترے لئے

گوندھی گئی ہے تارِ سخن میں، خبر بھی ہے
کن مہوشوں کی زلفِ پریشاں ترے لئے
کس کو خبر تراش کے کن ظلمتوں کا دل!
لایا ہوں میں یہ چشمۂ حیواں ترے لئے
میں تجھ سے کیا کہوں کہ سخن میں کیا ہے حل
کس شوخ کا تبسمِ پنہاں ترے لئے
واقف بھی ہے کہ موجِ سخن میں ہوئی ہے صرف
کن انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں ترے لئے
لایا ہوں وزن و شعر کی منزل میں کیا کہوں
کیونکر جراحتِ دلِ الناں ترے لئے
تعبیر کی نراز دے بزمِ نہفتہ میں
توڑے ہیں کتنے خوابِ پریشاں ترے لئے
کیا پوچھتا ہے جوشؔ کی بربادیوں کا حال!
پھاڑے ہیں کب سے جیب و گریباں ترے لئے

آتشکدہ

خواب کو جذبۂ بیدار دیئے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب

میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

پیمانِ محکم

قسم ان غازیوں کی، موت سے جو جنگ کرتے ہیں
اُنہی تلوار کی بُرِش سے جن کے زخم بھرتے ہیں
قسم ان کی جو ہنس کر خون میں اپنے نہاتے ہیں
خوشی سے رن میں جب ڈنکے، منہ پہ تلواریں جو کھاتے ہیں
قسم ان کی، نظر تیزیِ سناں سے جن کی لڑتی ہے
اکڑ جاتے ہیں طبلِ جنگ پر جب چوٹ پڑتی ہے
قسم اس نور کی بخشا گیا تھا جو رسالت کو
قسم اس سوزِ پنہاں کی جو ملتا ہے محبت کو!
قسم اس برق کی جو گر کے خرمن پھونک دیتی ہے
قسم اس موت کی جو خنجروں میں سانس لیتی ہے
قسم ہے اس کماں کی جو سرِ میداں کڑکتی ہے
قسم اس آگ کی جو قلبِ شاعر میں بھڑکتی ہے
قسم اس زخم خوردہ شیر کی خونی ڈکاروں کی
گرج سے جس کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں کچھاروں کی

قسم اس جذبۂ غیرت کی جو آزاد کرتا ہے
قسم اس طنطنے کی جس پہ ہر خود دار مرتا ہے
قسم اس شعلۂ غم کی، جو فرقت میں بھڑکتا ہے
قسم ہے اس لہو کی، چشم تر سے جو ٹپکتا ہے
قسم اس گھن گرج پر ہوں توپوں کے دہانوں کی
گرج سے جن کی ہل جاتی ہیں بنیادیں چٹانوں کی
قسم اس گھڑ گھڑاہٹ کی زرہ سے جو نکلتی ہے
قسم ان زمزموں کی، جن کی رو پر فوج چلتی ہے
قسم گھوڑوں کی ان ٹاپوں کی، جو دل کو ہلاتی ہیں
سروں پر گرد کا اک خونچکاں بادل بناتی ہیں
قسم اس سانس کی، جو موت کے ہنگام چلتی ہے
قسم اس وقت کی، جب زندگی کروٹ بدلتی ہے
قسم اس عزم کی، سادات جب میدان میں جاتے ہیں
دم رخصت عروس نو کا جب گھونگھٹ اٹھاتے ہیں
قسم اس کی، ثبوت اپنی شرافت کا جو لاتا ہے
بنا کے سینے پہ خوں کی مہریں لگاتا ہے!!
قسم اے موت ان کی، رنگ تیرا جو اڑاتے ہیں
تری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جو مسکراتے ہیں

قسم اُن قوتوں کی، جو بلی بخشیں رام و لچھمن کو!
قسم اس آگ کی، جو کھا گئی تھی ملک راون کو
قسم اس نور کی، روشن تھے جادے جس سے صحرا کے
جھمکتا تھا جو ٹیکے کی طرح ماتھے پہ سینا کے
قسم اس ضرب کی، توڑا تھا جس نے بابِ خیبر کو
قسم اس شیر کی جس نے چبا ڈالا تھا عنتر کو
قسم اس پیاس کی، کوثر کی رو پر جس کا قبضہ تھا
قسم اس ابر کی، جو کربلا میں گھر کے برسا تھا
قسم اس تیر کی، جلتا تھا جو چٹکی سے ارجن کی
قسم میداں میں گاتی ہوئی تلوار کی دھن کی
قسم اس جوشش کی، جو ڈوبتی نبضیں ابھارے گا
کہ اے ہندوستاں، جیسے ہی تو مجھ کو پکارے گا
مری تیغِ رواں، باطل کے سر پر جگمگائے گی
ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی

سنہ ۱۹۳۴ء

غلاموں سے خطاب

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ
شاعر ہے تو ملا دو خدا کے لیے نگاہ

اس خوفناک رات کی آخر سحر بھی ہے
تو دیکھ کروٹیں ہی رہیں بے خبر بھی ہے

اے اُمتِ شکستہ دل و اے گردہ شل
کب سے بلا رہا ہوں میں تجھ کو سوئے عمل

تجھ پر مرے کلام کا ہوتا نہیں اثر
چنگھاڑتا رہا ہوں کہ میں تجھ کو جھنجھوڑ کر

حالانکہ میرا شعر ہے وہ حرفِ تند و تیز
طوفاں بدوش و صاعقہ بنیاد و شرر خیز

منہ پر جو تھپیڑے بات میں پتھر کو توڑ دے
صرف اک صدا کہ بند لبِ ذرہ کو توڑ دے

چاہے تو زہر پر سے اٹھنے لگیں شرار
نکلے لگے ترے بطن سے پیدا ہو ذوالفقار

لگائے میرا شعر اگر جذبہ ہائے جنگ
پیدا ہو آبگینے کے اندر مزاجِ سنگ

خرمن میں میرا شعر اگر کج کرے کلاہ
خس تند بجلیوں سے لڑانے لگے نگاہ

آہن کے جوہر دل سے ٹپکنے لگے تراب
پیری کی ہڈیوں میں مچلنے لگے شباب

تجھ کو یقیں نہ آئے گا اے دائمی غلام!
میں جا کے مقبروں میں سنا دوں اگر کلام

خود موت سے حیات کے چشمے ابل پڑیں
قبروں سے سر کو پیٹ کے مردے نکل پڑیں

میرے رجز سے لرزہ براندام ہے زمین
افسوس تیرے کان پہ جوں رینگتی نہیں

تو چپ رہا زمیں ہلی ہر آسماں ہلا!
تجھ سے تو کیا خدا سے کروں گا میں یہ گلا

ان بزدلوں کے حسن پہ شیدا کیا ہے کیوں؟
نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں؟ سنہ ۱۹۳۳ء

ترکِ جمود

ہر اک کے واسطے یہ نازشِ دوام کہاں
نبردِ عشق کہاں جراتِ عوام کہاں

تڑپ کے مجھ کو پکارا ہے ملک و ملت نے
اب آج سے مجھے پروائے ننگ و نام کہاں

ہوا ہے حکم کہ لے کام موجِ صرصر سے
اب اختلاطِ نسیمِ سبک خرام کہاں

کہا گیا ہے کہ پی مہرِ نیم روز سے مے
اب انتظامِ شبِ ماہ رو و زرِ جام کہاں

عطا کیا ہے مشیت نے نظمِ دشت و جبل
دماغِ عشق کو اب فکرِ سقف و بام کہاں

نظر ہے اوج پہ جنبش میں ہیں پرِ پروانہ
بساطِ خاک پر اب فرصتِ قیام کہاں

نظر ہے جلوۂ عالم کی ناتمامی پر
اب اعتبارِ جمالِ مہ تمام کہاں

سرِ نیاز ہے خم پیشِ پختگانِ جنوں!
اب احترامِ دلِ افسردگانِ خام کہاں

نگاہ میں ہے جوانانِ برق رو کی روش
اب اقتدائے حریفانِ نرم گام کہاں
ہوا ہے حکم کہ بن رازدانِ آتش و برق!
اب چہرہ خوبانِ لالہ فام کہاں!
تغیرات کی رو سے گزر رہی ہے نگاہ
اب اہتمام تماشائے حسن بام کہاں
لب حیات نے چھیڑا ہے قصۂ خونیں!
مری زباں کو اب رخصت کلام کہاں
چلا ہوں سر بکف اس سمت آج خود ہی جوشؔ
اب آرزو کو سر نامہ و پیام کہاں

۲۵ ۱۹ء

نعرۂ شباب

(بوڑھے لیڈروں کی انجمن میں)

ہوشیار اپنی متاعِ رہبری سے ہوشیار
اے جنوں نا آشنا پیری وشیب ہرزہ کار

اڑ گیا روئے نگار آسماں سے رنگِ خواب
جھلملائی شمعِ رخصت ہو کر ابھرا آفتاب

ہٹ کہ اب سعی و عمل کی راہ میں آتا ہوں میں
خلق واقف ہے کہ جب آتا ہوں چھا جاتا ہوں میں

اے قدامت یہ کھلی ہے سامنے راہ فرار
بھاگ وہ آیا نئی تہذیب کا پروردگار!

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

کوئی قوت راہ سے مجھ کو ہٹا سکتی نہیں
کوئی ضربت میری گردن کو جھکا سکتی نہیں

رنگ سورج کا اڑاتا ہے مرے سینے کا داغ
بادِ صرصر کا بدل دیتا ہے رخ میرا چراغ

سنگ و آہن میں میری نظر دھنسے جاتی ہے پھانس
آندھیوں کی میرے میداں میں اکھڑ جاتی ہے سانس

دیکھ کر میرے جنوں کو ناز فرماتے ہوئے
موت شرماتی ہے میرے سامنے آتے ہوئے

الاماں گیرِ ریا آلودہ پیری الاماں
اب کڑکتی ہے تیرے سر پر جوانی کی کماں

ہو جو غیرت ڈوب مر یہ عمر یہ درسِ جنوں
دشمنوں کی خواہشِ تقسیم کی صید زبوں

یہ ستم کیا اے کنیزِ کفر دایماں کر دیا؟
بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قرباں کر دیا!

کر دیا طولِ غلامی نے تجھے کو نہ خیال
پھر رہا ہے یہ تیرے منہ پر کہ غداری کا جال
دیکھتی ہے صرف اپنے ہی کو اے دھندلی نگاہ
سر پھرا کے اٹھا ہے لیکن دل ابھی تک ہے سیاہ

پوپلے منہ ختم کر دیا عاقبت بینی کا شور
دیکھ اب بزدل مری ناعاقبت بینی کا زور
چہرہ امروز ہے میرے لئے ماہِ تمام
خوفِ فردا ہے مری رنگین شریعت میں حرام

تیر جاتی ہے دل فولاد میں میری نظر
خون میرا جنبندہ زن رہتا ہے موجِ برق پر
اور تمنائیں ہیں تیری سسکیاں بھرتی ہوئی
اور گھٹی کڑھتی بلکتی کانپتی ڈرتی ہوئی؟

تیری باتوں سے پڑی جاتی ہے کانوں میں خراش
کفر و ایماں کفر و ایماں تا کجا خاموش باش

حب السنہاں ذوقِ حق خوفِ خدا کچھ بھی نہیں
تیرا ایماں چند وہموں کے سوا کچھ بھی نہیں

تیرے جھوٹے کفر و ایماں کو مٹا ڈالوں گا میں
ہڈیاں اس کفر و ایماں کی چبا ڈالوں گا میں

دلوں سے میرے پر عصبیں کے ناز فرماتے ہوئے
فرقہ بندی کا سر ناپاک ٹھکراتے ہوئے

ڈال دوں گا طرح نو اجمیر اور پریاگ میں!
جھونک دونگا کفر و ایماں کو دہکتی آگ میں

کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لانے کے لئے
اک نیا سنگم بنا دوں گا زمانے کے لئے

ایک دین نو کی لکھوں گا کتاب زر فشاں
ثبت ہوگا جس کی زریں جلد پر ہندوستاں

اس سفینے سے یہ سارے تفرقے دار دونگا میں
تجھ پہ پھر گر دل ہلا کر قہقہے مار دونگا میں!

پھر اٹھونگا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا!
گھومتا گھرتا گرجتا گونجتا گاتا ہوا:-

خیموں میں لتھڑی بساط کفر و دیں الٹے ہوئے
فخر سے سینے کو تانے آستیں الٹے ہوئے

ولولوں سے برق کے مانند لہراتا ہوا !
موت کے سائے میں رہ کر موت پر چھایا ہوا

سنہ ۱۹۲۷ء

حسن اور مزدوری

ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں ہے بیقرار
چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹتی ہیں بار بار
چوڑیوں کے ساز میں یہ سوز ہے کیسا بھرا !!
آنکھ میں آنسو بنی جاتی ہے جس کی ہر صدا
گرد ہے رخسار پر زلفیں اٹی ہیں خاک میں
نازکی بل کھا رہی ہے دیدۂ غمناک میں
ہو رہا ہے جذب مہر خونچکاں کے روبرو
کنکروں کی نبض میں اُٹھتی جوانی کا لہو !
دھوپ میں لہرا رہی ہے کاکل عنبر سرشت
ہو رہا ہے کمسنی کا لوچ جزو سنگ و خشت
پی رہی ہیں سرخ کرنیں مہر آتش بار کی
نرگسی آنکھوں کا رس مے چمپئی رخسار کی

غم کے بادل خاطرِ نازک پہ ہیں چھائے ہوئے
عارض رنگیں ہائے یاد پھول مرجھائے ہوئے

چیتھڑوں میں دیدنی ہے روئے غمگیں شباب
ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ہو جیسے ماہتاب

اُف یہ ناداری مرے سینے سے اُٹھتا ہے دھواں
آہ اے افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں

حسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دستِ نازک اور پتھر توڑنے کے واسطے

فکر سے جھک جائے وہ گردن تف اے لیل و نہار
جس میں ہونا چاہیئے پھولوں کا اک ہلکا سا ہار!

آسماں جانِ طرب کو وقفِ رنجوری کرے
صنفِ نازک بھوک سے تنگ آ کے مزدوری کرے

اس جبیں پر اور پسینہ ہو جھلکنے کے لیے
جو جبیں نازہو افشاں چھڑکنے کے لیے

بھیک میں وہ ہاتھ اٹھیں التجا کے واسطے
جن کو قدرت نے بنایا ہو حنا کے واسطے

نازکی سے جو اُٹھا سکتی نہ ہوں کاجل کا بار
ان سبک پلکوں پہ بیٹھے راہ کا بوجھل غبار

کیوں فلک مجبور ہوں آنسو بہانے کے لیے
انکھڑیاں ہوں دلوں میں ڈوب جانے کے لیے

مفلسی چھانٹے اسے قہر و غضب کے واسطے
جس کا گھر اہو شبستاں طرب کے واسطے
فرطِ خشکی سے وہ لب ترسیں تکلم کے لئے
جن کو قدرت نے تراشا ہو تبسم کے لئے

نازنینوں کا یہ عالم مادرِ ہند آہ آہ
کس کے جور ناروا نے کر دیا گھر کو تباہ
ہن برستا تھا کبھی دن رات تیری خاک پر
سچ بتا اے ہند تجکو کھا گئی کس کی نظر

باغ تیرا کیوں جہنم کا نمونہ ہو گیا؟
آہ کیوں تیرا بھرا دربار سونا ہو گیا؟
سر برہنہ کیوں ہے وہ پھولوں کی چادر کیا ہوئی
اے شب تاریک تیری بزم اختر کیا ہوئی؟

جس کے آگے تھا قمر کا رنگ پھیکا کیا ہوا؟
اے عروس نو ترے ماتھے کا ٹیکا کیا ہوا؟

اے خدا ہندوستاں پر یہ نحوست تا بکجا؟
آخر اس جنت پہ دوزخ کی حکومت تا بکجا
گردن حق پر خراش تیغ باطل تا بہ کے؟
اہل دل کے واسطے طوق و سلاسل تا بہ کے

سرزمیں رنگ و بو پر عکس گلخن تا بکجا؟
پاک سینا کے لئے زنداں رادن تا بکجا

دست نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیے

۱۹۳۶ء

آثارِ انقلاب

قسم اس دل کی جس کا ہے جسے صہبا پرستی کا
یہ دل پہچانتا ہے جو مزاج اشیائے ہستی کا
قسم ان تیز کانوں کی کہ ہنگام قدح نوشی
سنا کرتے ہیں جو راتوں کو بحر و بر کی سرگوشی
قسم اس روح کی خو ہے جسے فطرت پرستی کی
گنا کرتی ہے راتوں کو جو ضربیں قلب ہستی کی
قسم اس ذوق کی حاوی ہے جو آثار قدرت پر
ضمیر کائنات آئینہ ہے جس کی لطافت پر
قسم اس حس کی جو پہچان کر تیور ہواؤں کے
سناتی ہے خبر طوفان کی طوفان سے پہلے
قسم اس نور کی کشتی جو ان آنکھوں کی کھنتیا ہے
جو نقش پا کے اندر عزم رہرو دیکھ لیتا ہے

قسم اس فکر کی سوگند اس تخیلِ محکم کی
جو سنتی ہے صدا ایک جنبش مژگان عالم کی
قسم اس آنکھ کی جو درس بینش مجھ کو دیتی ہے
زمیں کی بھاپ میں جو بجلیوں کو دیکھ لیتی ہے
قسم اس روح کی جو عرش کو رفعت سکھاتی ہے
کہ راتوں کو مرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے
اٹھو وہ صبح کا غرفہ کھلا زنجیر شب ٹوٹی
وہ دیکھو پو پھٹی غنچے کھلے پہلی کرن پھوٹی
اٹھو چونکو، بڑھو منہ ہاتھ دھو آنکھوں کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو

صدائے بیداری

یہ مانا سرزمین ہند پر نکبت برستی ہے
زبانوں پر حدیث ادرج ہے فکر دل پستی ہے
یہ مانا آج ہم میدان وحشت میں رجز خواں ہیں
عدو بھی سر پہ ہے آپس میں بھی دست و گریباں ہیں

مگر راتوں کو جب فکرِ وطن میں سر جھکاتا ہوں
فضائے سرد میں دھیمی سی اک آواز پاتا ہوں

یہ آواز اس لطافت سے مرے کانوں میں آتی ہے
صبا جس طرح زیرِ شاخِ سنبل گنگناتی ہے!

فضا میں جس طرح روح الامیں کی بال جنبانی
برستا ہو کہیں کچھ دور جیسے خواب میں پانی

جگاتی ہے سحر جس ناز سے نغموں کو دریا میں
ہو سنسناہٹ جس طرح گنجانِ صحرا میں

حقیقت کیا بتاؤں اس صدائے روح افزا کی
نہاں ہیں جس کے اندر کاوشیں امروز و فردا کی

یہ مشرق محو ہے صبح تجلی زار ہونے میں
یہ روحِ ایشیا مصروف ہے بیدار ہونے میں

سنہ ۱۹۲۸ء

ملکوں کا رجز

انگلستان

مری روح عمل پر تنگ ہے عالم کی پہنائی
مرے پاسے تجارت پر جلال تاج دارائی
مری مٹھی میں ہے خورشید خاور بحر بے پایاں
مری جودت کے آگے سرنگوں قوموں کی دانائی
معاذ اللہ میرے پنجۂ ہمت کی گیرائی

امریکہ

مری دولت کے آگے دولت قاروں ہے شرمندہ
مرے آئیں محکم ہیں، مری تعمیر پائندہ
مرے آئینۂ ثروت میں عکس زندگی غلطاں
مری پیشانیٔ ہمت پہ برق عزم رخشندہ
مری جانکاہیاں بیدار میری قوتیں زندہ

فرانس

جواہر جنگ عالم گیر کے میرے خزانوں میں
بہشت رنگ وبو میرے مہکتے گلستانوں میں
دلوں میں عشق کی گرمی سروں میں عقل کا سودا
کبھی گم لحن خوباں میں کبھی جنگی ترانوں میں
مری راتیں نگاروں میں مرے دن کارخانوں میں

جرمنی

خرابی سے ہمیشہ درس استحکام لیتا ہوں
حریفوں کی نزاع باہمی سے کام لیتا ہوں!
عروس ارتقا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا !
جو چھٹ جاتا ہے تو پھر بڑھ کے دامن تھام لیتا ہوں
خدا چاہے تو پھر اب تیغ خوں آشام لیتا ہوں

روس

رواں ہے تیغ میری گردن غفلت شعاری پر
مرادل خوں ہے مزدور کی فریاد وزاری پر

جھکے ہیں کشت دہقاں پر مرے اُمڈے ہوئے بادل
تپاں ہے برق میری خرمن سرمایہ داری پر!
عرق ہے میری ہیبت سے جبیں شہریاری پر

جاپان

رہِ علم و عمل میں دیر سے ہنگامہ آرا ہوں
طلسم کاروبارِ شوق و طوفان تمنا ہوں:
قسم کھائی ہے میری سعی نے بیدار بختی کی
میں ہر بازار کا یوسف ہوں ہر صنعت کا مولا ہوں
غرور ایشیا ہوں محرم امروز و فردا ہوں

ترکی

مرے افکار میں تہذیب نو کی کارفرمائی
پڑی ہے اک نئی صورت سے طرح بزم آرائی
مریض جاں بہ لب سمجھے ہوئے تھی جسکو اک دنیا
خدا کا شکر اب ہے محشر زور و توانائی ؟!
توانائی کے پردے میں ہے اعجاز مسیحائی

ایران

تبسم آفریں ہے پھر طلوع صبح نورانی !
کیانی شان وشوکت پھر ہے گرم بال جنبانی
گھٹا چھائی ہے رکنا بادِ دبستان مصلّی پر
برسنے پر ہے جذب کاوش وعزم جہانبانی
مبادا ایں جمع را یارب غم از بادِ پریشانی

افغانستان

مرے دشت وجبل پر مہر آزادی کی تنویریں
پڑی ہیں دیر سے ٹوٹی ہوئی غفلت کی زنجیریں
مرے سادات میدانوں میں نکلے ہیں علم کھولے
جبینوں پر ابھر آئی ہیں خود داری کی تحریریں !
نگاہوں میں چمکتی بجلیاں ہاتھوں میں شمشیریں

ہندوستان

نہنگوں کا سمندر ہوں درندوں کا بیاباں ہوں !
عدو سے کیا غرض اپنوں سے ہی دست و گریباں ہوں
خدا کے فضل سے بدبخت ہوں بزدل ہوں ناداں ہوں
مری گردن میں ہے طوق غلامی پا بجولاں ہوں !
در آقا پہ سر ہے کفش برداری پہ نازاں ہوں

سنہ ۱۹۲۸ء

بیدار ہو بیدار

اے مرد خدا فتنہ اغیار سے ہوشیار
ہوشیار رہو، ہوشیار رہو ہوشیار رہو
ہم تجھ سے نہ کہتے تھے کہ ہونے کو ہے پیکار !
لے آگئی وہ سر پہ چمکتی ہوئی تلوار !
بیدار ہو بیدار رہو ہشیار رہو بیدار !
بیدار رہو بیدار !!

بیدار ہے پھر فتنۂ چنگیز جہاں میں
اور تو ہے ابھی تک اثرِ خوابِ گراں میں
میساد کمینوں میں ہیں تارک ہیں کماں میں
پیشانیِ دوراں پہ ہیں شب خوں کے آثار
بیدار رہو، بیدار رہو بیدار رہو بیدار
بیدار رہو بیدار!!

تو نے روشِ خدمتِ اغیار نہ چھوڑی
اب تک رسن سجہ و زنار نہ چھوڑی!
آشفتگیِ اندک و بسیار نہ چھوڑی
افسوس ہے اے جنسِ غلامی کے خریدار
بیدار رہو بیدار بیدار رہو بیدار!
بیدار رہو بیدار!!

شیون کبھی بلبل کو گوارہ نہیں ہوتا
جب تک گل رنگیں کا اشارہ نہیں ہوتا
بے آگ جو چڑھتا ہے وہ پارا نہیں ہوتا
بے وجہ نہیں کشمکش کافر و دیندار
بیدار رہو بیدار رہو بیدار رہو بیدار!
بیدار رہو بیدار رہو!

مرہم ابھی طیار نہیں زخم رسیدہ!
افسوس ہے اے صاحب اوصاف حمیدہ
گرگ دہن آلودہ و یوسف نہ دریدہ!
اے مصر کے بازار میں یوسف کے خریدار

بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار
بیدار ہو بیدار

اب تک تری محرومیٔ تقدیر وہی ہے
بدلے ہوئے الفاظ ہیں تقریر وہی ہے
گو روپ تو زلفوں کا ہے زنجیر وہی ہے
ہر حلقۂ کاکل میں ہے زنجیر کی جھنکار!

بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار
بیدار ہو بیدار!!

یک رنگ ہے جو جیت ہے دنیا میں اسی کی
اے صید کشاکش یہ دو رنگی نہیں اچھی
یا اپنے کف پا میں لگا ناز سے مہدی
یا جامۂ ہستی کو بنا خوں سے گلنار

بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار
بیدار ہو بیدار!!

دم بھر تو کبھی غور کر اے خفتہ مقدر!
مادہ تجھے قدرت نے بنایا ہے کہ ہے نر

یا اوڑھ لے اے زہرہ جبیں مقنع و چادر
یا کھینچ لے اے مردِ خدا میاں سے تلوار

بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار!
بیدار ہو بیدار!!

یا جلوۂ رنگیں میں دکھا عشوۂ پُرفن!!
یا رن میں کچھ اس شان سے آ گونج اٹھے رن
یا گوندھ کے چوٹی کو پہن پھول کے کنگن
یا سر سے کفن باندھ کے مرنے پہ ہو طیار

بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار
بیدار ہو بیدار!

یا فرشِ عروسی پہ بدل ناز سے پہلو
یا عرصۂ جرأت میں دکھا قوتِ بازو
یا رقص کی محفل میں بجا تال سے گھنگرو!
یا جنگ کے میداں میں سنا تیغ کی جھنکار

بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار!
بیدار ہو بیدار!!

سنہ ۱۹۲۹ء

کسان

جھٹپٹے کا نرم رو دریا شفق کا اضطراب
کھیتیاں میدان خاموشی غروب آفتاب
دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دور دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ
زیرِ لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود
مشعل گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دود
وسعتیں میداں کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ
سبزۂ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ
خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گلا!
اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلہ
خار و خس پر ایک درد انگیز افسانے کی شان
بام گردوں پر کسی کے روٹھ جانے کی شان
دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور
چرخ پر بادل زمیں پر تتلیاں سر پر طیور

پارہ پارہ ابر سرخی سرخیوں میں کچھ دھواں
بھولی بھٹکی سی زمیں کھویا سماں!
پتیاں مخمور کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی!
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی
یہ سماں ادراک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار!
طفل باراں تاجدار خاک امیر بوستاں
ماہر آئین قدرت، ناظم بزم جہاں!
ناظر گل پاسبان رنگ و بو گلشن پناہ
ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ۔
وارث اسرار فطرت فاتح امید و بیم
محرم آثار باراں واقف طبع نسیم!
صبح کا فرزند خورشید زر افشاں کا علم
محنت پیہم کا پیماں سخت کوشی کی قسم!
جلوہ قدرت کا شاہد حسن فطرت کا گواہ
ماہ کا دل، مہر عالم تاب کا نور نگاہ!
قالب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نظام
منکشف جس کی فراست پر مزاج صبح و شام
خواں ہے جس کی جوانی کا بہار روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار

جس کی محنت کا عرق طیار کرتا ہے شراب
اڑ کے جس کا رنگ بنجاتا ہے جانِ برگِ گلاب

قلبِ آہن جس کے نقشِ پا سے ہوتا ہے رقیق
شعلہ خو جھونکوں کا ہمدم تیز کرنوں کا رفیق

خوں جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب
جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہِ آفتاب

لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو
جس کے دل کی آنچ بنجاتی ہے سیلِ رنگ و بو

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر

جس کی جانکاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبضِ خاک
جس کے دم سے لالہ و گل بنکے اتراتی ہے خاک

سازِ دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ
مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ

خوں جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں

جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عز و وقار
ہوتی ہے دریوزہ تابش کلاہِ تاجدار!

سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی!!!

جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن انسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتیلی پر تمدن کا چراغ!
جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرور شہر یار
دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر پر بغل میں پھاوڑا تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی دوش پر مضبوط ہل
کون ہل ظلمت شکن قندیل بزم آب و گل
قصر گلشن کا دریچہ سینۂ گیتی کا دل!!
خوشنما شہروں کا بانی راز فطرت کا سراغ
خاندان تیغ جوہر دار کا چشم و چراغ
دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام
شام زیر ارض کو صبح درخشاں کا پیام
ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مضمحل ذروں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا!
جس کے چھو جاتے ہی مثل نازنین مہ جبیں
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں!
پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک
مسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک

جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی
خاک کے مایوس مطلع پر کرن امید کی!
جس کا مس خاشاک میں بنتا ہے اک چادر مہین
جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمیں
ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں
اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر
جس میں آجاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے
دیکھتا ہے ملکِ دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے رہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار
گھر کی نا امید دیوی کا شباب سوگوار!!
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائیگا
بے ردا بیوی کا سر بچوں کا منہ اترا ہوا!!!
سیم و زر نان و نمک آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک دل اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے
یہ ستم اے سنگدل سرمایہ داری ہائے ہائے
تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مڑتی ہے دھار
بیکسوں کے خوں میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہات
کیا اجاڑے گی او کمبخت ساری کائنات
ظلم اور اتنا کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
دیکھ کر تیرے ستم اے حامیٔ امن و اماں
گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں
ادعا ہے پیروی دین و ایماں اور تو
دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو
ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں
کئی طوفان تیری کشتی کے لئے بے تاب ہیں

سنہ ۱۹۳۹ء

زوالِ جہانبانی

مبارک ہیں مبارک دشمنوں کے جو پہ پنہانی
کہ مشکل گردشیں ہے سے کے بنجاتی ہے آسانی!

تجھے معلوم ہیں تاریکیاں بڑھتی ہیں جب حد سے !!!!
ابلنے لگتی ہے ذرات خاکی سے درخشانی !!!

دیار مصر میں برسوں مسلسل قحط پڑتے ہیں
کہیں ہوتی ہے جب شاداب کشت پیر کنعانی

منقش ہو نہ جب تک دیدۂ خونبار سے چہرہ
نہیں کھلتی عروس رنگ و بو کی چیں پیشانی ۰

سمجھتا بھی ہے کیوں غنچوں کے سینے چاک ہوتے ہیں
شگوفوں کو ہے اس پردے میں درس عطر افشانی

نہانی ہیں لہو میں جب بہاریں حب قومی کی!
تو ہوتا ہے شگفتہ لالہ زار حب انسانی!

ہزاروں آسماں جب سر پہ ظالم توڑ چکتا ہے
اٹھاتا ہے کہیں جھنجلا کے تب مظلوم پیشانی

اسیروں کی تڑپ بجلی گرا دیتی ہے زنداں پر
قفس کے حق میں اک شعلہ ہے حاصل کی پرافشانی

پگھلتا ہے گدا کے دل میں آزادی کا جب شعلہ!
لرز اٹھتا ہے پھنک جانے کے ڈر سے تاج سلطانی

گذر جاتی ہے جب افتادگی میں جوئے خوں سر سے
کہیں جب تخم کو ملتا ہے فرمان گل افشانی

نہ گھبرا قید و پابندی سے پابندی وہ دولت ہے
کہ بن جاتا ہے دُرِّ بے بہا اک بوند بھر پانی

کلید فتح بن جاتا ہے اک دن قفل زنداں کا
سنا تو ہوگا تو نے بھی فسانہ ماہ کنعاں کا

تبسم کی ہوائیں چل رہی ہیں صحن عالم میں
بکھرنے پر ہے شیرازہ کتاب اشکباری کا

چمن سے آرہی ہیں پھر صدائیں عندلیبوں کی
کلی کو چھو رہا ہے پھر نفس باد بہاری کا

شعاع حسن لیلیٰ موجزن ہے چشم مجنوں میں
ہوائے نجد نے الٹا ہے پردہ پھر عماری کا

فضا میں پھر تڑپتی ہیں شعاعیں مہر کاوش کی
دلوں میں پھر بھڑک اٹھا ہے شعلہ بے قراری کا

برستی ہیں فلک سے کاہشیں پھر سرفروشی کی
ابلتا ہے زمیں سے دیو یہ جاں سپاری کا

مچلنے ہی پہ ہے اب آنکھ غیرت غلامی کی
نشانہ ختم ہے اب غیر کی خدمت گزاری کا!

رکابیں تھام کر چلنے لگے تھے بوریا بافوں کی
سبق دہرا رہے ہیں پھر سے مشق شہسواری کا

زخم کچھ پیدا سا ہے پھر چھوٹی ہوئی نبضوں میں مشرق کی
کلیجہ خوں ہے پھر مغربی تیمار داری کا!

نظر ہے کلبۂ مزدور پر معمار فطرت کی
تلاطم میں ہے قصر آہنی سرمایہ داری کا

شہاں کج کلہ پر تنگ ہے عالم کی پہنائی
زر دہقاں پہ دستک دے رہی ہے شان دارائی

جہانبانی دہکتی آگ ہے گرتی ہوئی بجلی
ہمیشہ اس نے دنیا میں کیا نور فتن پیدا

ہزاروں تجربوں کے بعد اب انسان یہ سمجھا ہے
کہ منشا بھی یہ نہیں ہوتا شرافت کا چلن پیدا

نہ ہو جن میں جفا جب تک جبین شہریاری میں
نہیں ہوتا کلاہ خسروی میں بانکپن پیدا

چٹانیں سر زمیں کی سنگریزے خوں رلائیں گے
مگر ہوگا نہ عشرت میں گداز کوہکن پیدا!

امید اس سے نہ کر نادان مرغان خوش الحاں کی
ہمیشہ جس بیاباں سے ہوئے زاغ و زغن پیدا!

اسے بوئے گل و سیراہن یوسف سے کیا نسبت
ہوا کرتا ہے جس صنعت سے کافور و کفن پیدا

ترا اے حامی نادِ علم کیا یہ عقیدہ ہے !!
کہ ہو سکتی ہے نافِ گرگ سے مشکِ ختن پیدا

تجھے بیگانۂ دمنع جہاں کیا یہ توقع ہے
کہ ہونگے مکتبِ دشنام سے شیوہ سخن پیدا

سمجھتا ہے کہ وہ حق بات کی تلخی کو سہہ لے گا
خوشامد سے کبھی جس ماتھے پہ ہو اگر شکن پیدا

سمجھ اے غافل کہ تا روزِ قیامت نسلِ شاہی
نہ ہوگا بزمِ انسانی کا صدرِ انجمن پیدا

مروت آئے گی اس وقت چشمِ شہریاری میں!
جلش کی خاک سے جس وقت ہوں گے ہم وطن پیدا

ڈریں گے کہر سے اس روز یہ نسریوں کے والانش
سرِ یزداں میں ہو گا جب دماغِ اہرمن پیدا

نظر ڈالی نہیں تو نے کبھی آئینِ فطرت پر
کیا ہے آج تک شعلے نے برگِ یاسمن پیدا

بہا ہے موت کے چشمے سے دریا آبِ حیواں کا
ہوا ہے سینۂ شمشیر سے دریمن پیدا !

جہاں اگتے ہوں نیزے اس زمیں قہرِ فطرت سے
سمجھتا ہے کہ ہونگے سرو و شمشادِ چمن پیدا !!

رگِ آہن سے ٹپکی ہیں شرابِ ناب کی بوندیں
خمِ زنجیر سے ہوتی ہے زلفِ پُرشکن پیدا

اٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایہ داری کی
جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلا دے شہریاری کی

تن نازک پہ تیرے رحم آتا ہے مجھے لیکن
نہ دوں دعوت تجھے کس طرح تو بت آزمانے کی

تجھے اے کاش شاعر کی طرح محسوس ہو سکتا
نظر پڑتی ہے تجھ پر کس حقارت سے زمانے کی

ازل سے نوع انسانی کے حق میں طوق لعنت ہے
کسی ہم جنس کی چوکھٹ پہ عادت سر جھکانے کی

نہ ہو مغرور اگر مائل بہ نرمی بھی ہو سلطانی!
کہ یہ بھی ایک صورت ہے تجھے غافل بنانے کی

گئے وہ دن کہ تو زنداں جب آنسو بہاتا تھا!
ضرورت ہے قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی

گئے وہ دن کہ تو محرومی قسمت پہ روتا تھا
ضرورت ہے تجھے اب آفتوں پر مسکرانے کی

تڑپ پیہم تڑپ اتنا تڑپ برق نشیاں بن جا
خدارا اے زمین بے حقیقت آسماں بن جا

۱۹۲۸ء

نازک اندامانِ کالج سے خطاب

چھین لی تم نے لبھاوٹ سے ہر شیریں ادا
مرحبا اے نازک اندامانِ کالج مرحبا

جنگ سر پر اور یہ محبوبیت چھائی ہوئی!!
ناز سے نیچی نگاہیں چال اٹھلائی ہوئی!

انکھڑیوں میں عشوۂ ترکانہ در کھوئے ہوئے
سینٹ کی خوشبو میں روحِ ناز پر تولے ہوئے

خال و خد سے جذبہائے صنفِ نازک آشکار
کرزنی چہروں میں زن بننے کے ارماں بیقرار

الحذر یہ جنبشِ مژگاں کا شیریں ارتعاش
عزتِ آبا کا دل ہے جسکی رو میں پاش پاش

الاماں یہ زینتیں ہونٹے ہیں گو اترے ہوئے
ذوق ہے گھنگرو کا گیٹس!! دل میں پہنے ہوئے

ریشمی رومال سے ہے فرقِ نازک پر بہار
اوڑھنی پر دیدنی ہے راہ کا گردِ غبار

نازکی کا مقتضا پتلی چھڑی باندھے ہوئے!
شوق کنگن کا کلائی پر گھڑی باندھے ہوئے

جنگ اور نازک کلائی . پیچ ہیں تقدیر کے
مڑ نہ جائے گی نگوڑی بوجھ سے شمشیر کے

پاؤں رکھتے ہو دمِ گل گشت کس کس ناز سے
اے ہیں قرباں زن ہیں نکلو گے اسی انداز سے

زیر سے توپوں کے منہ کھولے ہوئے ہے روزگار
سینۂ گیتی بنی ہے جس کی دھمک سے خلفشار

شغل زینت سے تمہیں فرصت مگر ملتی نہیں
کیا تمہارے پاؤں کے نیچے زمیں ہلتی نہیں

سن لو جو موزوں نہیں مردانہ سیرت کے لئے
زندگی ان کی دیا ہے آدمیت کے لئے :.:

مرد کہتے ہیں اسے اے مانگ چوٹی کے غلام
جس کے ہاتھوں میں ہو طوفانی عناصر کی لگام

مرد کی تخلیق ہے زور آزمانے کے لئے
گردنیں سرکش حوادث کی جھکانے کے لئے

مرد ہے سیلاب کے اندر اکڑنے کے لئے
بحر کی بپھری ہوئی موجوں سے لڑنے کے لئے

مرد کہتے ہیں اسے اے بندگانِ طمطراق
جو جلائے برق دبارہ اس کا اڑاتا ہو مذاق

جنگ میں ہو بانکپن جس کی شجاعت کا گواہ
رزم کے میدان میں کج کرتا ہو ماتھے پہ کلاہ

دوڑتا ہے شعلہ خو بجلی کا دامن تھامنے
مسکراتا ہو گرجتے بادلوں کے سامنے
مضحکہ کرتا ہو خوں آشام تلواروں کے ساتھ
کھیلتی ہوں جسکی ہنسدیں سرخ انگاروں کے ساتھ
تم مگر اس زندگی کے کھیل سے رہتے ہو دور
آفریں اے عصر حاضر کے جوانانِ غیور
ہے تمہارا ارتقا پر در زدہ سعی زوال
الاماں تعلیم کالج کا اجی پر در مال !!
جیب میں کوڑی نہیں اور اس قدر شان شکوہ
سر جھکا لے شرم سے اے فاقہ مستوں کے گروہ
یوں تمہارے منہ کے اندر ہے فرنگی کی زباں
خوف ہے گو لنگا نہ ہو جائے کہیں ہندوستاں
یہ لباس مغربی جلوؤں کو چمکاتا نہیں
تم کو اس بہروپیئے پن سے حجاب آتا نہیں
کیا غضب ہے تم بنے بوسے ایشیائی نہیں
سچ کہو کیا واقعی تم کو حیا آتی نہیں !!
زندگی طوفاں ہے اور نا ہو تم پاپ کی
آنچ لیتی جا گئی بدبختیو ماں باپ کی

یہ بھی کوئی زندگی ہے غم کی ماری زندگی
نوع انسانی کی ذلت ہے تمہاری زندگی
یہ بھی کوئی زندگی ہے سست و غافل زندگی
بے حمیت بدگہر بے روح بزدل زندگی

یہ بھی کوئی زندگی ہے پست و ابتر زندگی
فکر سے کچلی ہوئی بیمار و لاغر زندگی!
یہ بھی کوئی زندگی ہے بے نظام و بے اساس
جذبۂ تقلید مغرب میں زبوں و بدحواس

آہ بھری زندگی آنسو بہاتی زندگی ہے!!
بھوک کی دلدل کی تہ میں کلبلاتی زندگی
بھاگتی بچتی دبکتی تھرتھراتی زندگی ہے
کانپتی ڈرتی لرزتی کپکپاتی زندگی

جس کو اک دن بھی نہ حاصل بارغ البالی ہوئی
موت کے بے رحم و سرد آغوش کی پالی ہوئی
راستہ دیتی ہوئی پیہم سرکتی زندگی
پیٹ کے بل رینگنے والی سسکتی زندگی

مفلسی کی یورش پیہم سے گھبرائی ہوئی
غیر کی رزندی ہوئی دشمن کی ٹھکرائی ہوئی۔

آہ اے بیگانۂ انجام و آغازِ حیات !
سن کہ تا کھل جائے تیری موت پر رازِ حیات
اہلِ عالم کی نظر میں محترم ہوتا نہیں !
مرد جب تک صاحبِ سیف و قلم ہوتا نہیں
سیف کا دامن تو ہے اک عمر سے چھوٹا ہوا
اور قلم ہے اک سو وہ بھی خیر سے ٹوٹا ہوا
کچھ خبر بھی ہے تجھے اے طفلکِ زار و نزار !
زیست کا ہے دست و بازو کی صلابت پر مدار
غور سے سن اے نگارِ مجلسِ تہذیبِ خام
کھرورے ہاتھوں میں رہتی ہے حکومت کی لگام
بل پہ لو ہے کے جو لے سکتا ہے دنیا سے خراج
جگمگاتا ہے اسی کے فرق پر سونے کا تاج
فکرِ ناقص کو تری سرمایۂ تحقیق دے
کاش دنیا مرد بننے کی تجھے توفیق دے
عزم ترا آگ کے سانچے میں جب ڈھل جائیگا
طوقِ محکومی کا لوہا خود بخود گل جائے گا !

سنہ ۱۹۳۱ء

بغاوت

ہاں بغاوت، آگ، بجلی، موت آندھی میرا نام
میرے گرد وپیش اجل میری جلو میں قتل عام
زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روئے حیات
کانپ اٹھتی ہے مری چینِ جبیں سے کائنات
جنگ کے میدان میں میری سیف کی اللہ ری ضو
خاک بن جاتی ہے بجلی، برف دے اٹھتی ہے لو
ذکر ہوتا ہے مرا پرہول پیکاروں کے ساتھ
ذہن میں آتی ہوں تلواروں کی جھنکاروں کے ساتھ
اللہ اللہ کر دلیں میرے دل آزاد کی
جن سے گر جاتی ہیں ڈاڑھیں قصرِ استبداد کی
میری اک جنبش سے ہوتا ہے جہاں زیر و زبر
میری سرتابی ثریا کا جھکا دیتی ہے سر
ایک چنگاری مری جنت کو کرتی ہے تباہ
مانگتا رہتا ہے میری آگ سے دوزخ پناہ
الحذر! میری کڑک کا زور رہنما مسعان
صاف ہو جاتا ہے ایوانِ حکومت میں شگاف

اللہ اللہ بزمِ ہستی میں مری گُل باریاں
ٹکڑے ٹکڑے دست و بازو ریزہ ریزہ استخواں

الاماں والحذر! میری کڑک، میرا جلال
خوں شُفا کی گرج طوفان، بربادی، قتال

برچھیاں، بھالے، کمانیں تیر تلواریں کٹار
بیرقیں، پرچم، علم، گھوڑے پیادے شہسوار

آندھیوں سے میری اڑ جاتا ہے دنیا کا نظام
رحم کا احساس ہے میری شریعت میں حرام

موت ہے خوراک میری ہوں ہے چلتی ہوا میں
سیر ہو کر گوشت کھاتی ہوں، لہو پیتی ہوں میں

پیاس سے باہر نکل پڑتی ہے جب میری زباں
بہنے لگتی ہیں سرِ میداں لہو کی ندیاں

جنگ کی صورت سے کو ہنگامہ کرتی ہوں شروع
امن کی صبحیں مرے خنجر سے ہوتی ہیں طلوع

میرا مولد مفلسی کا دل ہے عشرت کا دماغ
میری پیدائش کے حجرے میں غنیمی جلتا چراغ

گود میں ناداریوں کی پرورش پاتی ہوں میں!!
بے زری کے بادلوں میں زلف بکھراتی ہوں میں

بھوک نے ہر چند کیا گیا سر گراں ہوتی ہوں میں
بھوک ہی کا دودھ پی پی کر جواں ہوتی ہوں میں

گرم نالے منہ اندھیرے سے جگاتے ہیں مجھے
اشک غم ہر صبح آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

مجھ کو بچپن کے زمانے ہی سے ہر صبح و مسا
پیٹ کی ماری ہوئی مخلوق دیتی ہے غذا

جس کو حاصل زندگی کا کچھ مزا ہوتا نہیں
کچھ بھی جس کے پاس ماضی کے سوا ہوتا نہیں

جسکی چشم تر میں یوں کھاتے ہیں پیچ و تاب
دھار پر تلوار کی جیسے شعاع آفتاب!

ختم ہو جاتا ہے جب اہل جہاں کا غلغلہ
رات کے آغوش میں کھلتا ہے میرا مدرسہ

کھل کے پوری سانس لینے سے بھی گھبراتی ہوں میں
درس لینے کے لئے پنجوں کے بل جاتی ہوں میں

ہر قدم پر بھوت آوازیں سناتے ہیں مجھے
تیرہ دیواروں کے سائے تک ڈراتے ہیں مجھے

ایک دنیا سے نرالی ہے مرے مکتب کی شان
بند ہو جاتی ہیں آنکھیں اور کھلے رہتے ہیں کان

بستۂ قرطاس ہو سکتی نہیں میری کتاب
خون کی چادر پہ چھپتا ہے مرا خونی نصاب

اف در و دیوار میرے مدرسے کے الاماں
درس دیتی ہیں جہاں سہمی ہوئی سرگوشیاں

دیکھنے سے جن کے، پتھر کا بھی دل ہو جائے شق
مجھ کو وہ اترتے ہوئے چہرے بڑھاتے ہیں سبق

اول اول جان دینے کا سبق لیتی ہوں میں
آخر آخر جان لینے کا سبق لیتی ہوں میں

کچھ دنوں تو فرط حیرت سے ہیں رہتی ہوں خموش
آخر آ جاتا ہے میری روح سرتابی کو جوش!

پھر تو بن جنگھاڑتی ہوں خوفناک انداز میں
موت کی آواز ہوتی ہے مری آواز میں

برق کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں گفتاریں مری
میاں سے باہر ابل پڑتی ہیں تلواریں مری

موت بن کر زندگی کے سر پہ چھا جاتی ہوں میں
سب سے پہلے بڑھ کے غداروں کو کھا جاتی ہوں میں

سلطنت کی سمت پھر بڑھتی ہوں بل کھاتی ہوئی
قید اور قانون کو ذلت سے ٹھکراتی ہوئی!!

اپنی رو کی گرد میں صحن زمیں الٹے ہوئے
میاں سے خنجر نکالے آستیں الٹے ہوئے

باسوز ذلت سے جو پہلو مشتعل رکھتے نہیں
ہاں وہی غدار، سینوں میں جو دل رکھتے نہیں

باندھتی ہوں شہ‌دلوں کے سر پہ تیغ کہہ کر کفن
تم ہوا شجیع، ناوک افگن، صف شکن، شمشیر زن

تم ہو غازی، جنگ جو، لشکر شکن، میر سپاہ
تم ہو رستم، مرد میداں، شیر دل، عالم پناہ
تم ہو سرلشکر، سپاہی، برق پیما، سخت کوش
تم ہو صفدر، سورما، ساونت، سرکش، سرفروش

ایڑیاں تم اب رگڑ و آب و ناں کے واسطے
ریڑھ کی ہڈی ہو تم جسم جہاں کے واسطے
اے جوانمردو! یہ ذلت کس لئے سہتے ہو تم
مرد ہو کر ٹھوکروں کی زد پہ کیوں رہتے ہو تم

مادہ سیرت بن کے تو رہتے نہیں دنیا میں شیر
ٹھوکروں کے واسطے ہوتا نہیں مردوں کا سر
لختِ دل انسان کھائے اور خونِ دل پیئے
تف ہے اس جینے پہ، مر مر کر جیئے تو کیا جیئے

سچ کہو تم ننگِ محکومی سے شرماتے نہیں
کیا تم اپنی عورتوں کے سامنے جاتے نہیں
کب نکالو گے تمنائیں دلِ برباد کی
کیا ہوئیں تیغیں تمہارے نامور اجداد کی

اے جوانمردو! خدارا باندھ لو سر سے کفن
منتظر پھر رہی ہے عزتِ قوم و وطن
ہاں زمیں کو زیر کر کے آسمانوں پر چڑھو!
ہاں بڑھو اے صف شکن بیرو! بڑھو جلدی بڑھو

پاؤں میں تا چند زنجیرِ غلامی کی خراش
صرف اک جنبش! ابھی ہوتی ہیں کڑیاں پاش پاش
میری آواز دل سے کانپ اٹھتا ہے روحوں کا سکوں
جذبۂ عزت کی آنکھوں میں اتر آتا ہے خوں
شور اٹھتا ہے محض ایک وہم ہے دار و رسن
یا تو اب ہم تاج ہی پہنیں گے یا خونیں کفن

کپکپاتی ہے زمیں اٹھتا ہے ہلکا سا غبار!
دوڑنے لگتے ہیں مرکب بڑھنے لگتے ہیں سوار
طبل کی ڈوں ڈوں سے جل اٹھتے ہیں آنکھوں میں چراغ
جھنجھناتے ہیں جلاجل سنسناتے ہیں دماغ
کھلنے لگتا ہے مگر جس وقت پرچم جنگ کا
پہلے بڑھ کر میں حکومت کو یہ دیتی ہوں صدا

اے جفا پرور امارت! دیکھ ناداروں سے بھاگ
بھاگ، دیوانوں کی خوں آشام تلواروں سے بھاگ
موت کا پیغام ہے بپھرے ہوئے شیروں کا وار
مدعی! کف در دہاں آبادیوں سے ہوشیار!
خلق ہے بیتاب ترا منہ جھلسنے کے لیے
تیرے سونے پر ہے اب لوہا برسنے کے لیے
تیرا مطبخ مفلسوں کی بھوک کھا جانے کو ہے
تیرے زر کی سرخیوں میں آگ لگ جانے کو ہے

حریت کی تند لہروں میں ٹھہر سکتا ہے کون ؟
جذبۂ خلق خدا کو فتح کر سکتا ہے کون ؟
اب بھی آنکھیں کھول اے جن خودی، دلوریا!
جذبۂ خلق خدا ہے اصل میں عزم خدا !
راہ سے اپنی مشیت کو ہٹا سکتا ہے کون
عظم خلاق جہاں کا سر جھکا سکتا ہے کون
گونجنے لگتی ہیں جب میری صدائیں مثل صور
سر اٹھا کر مسکراتا ہے حکومت کا غرور !
مضحکہ، اور قطرۂ شبنم کا، انگاروں کے ساتھ !
پنکھڑی، اور ناز سے پیش آئے تلواروں کے ساتھ
عقل کا دست تنک، رخش جنوں کی باگ پر
قہقہہ خس کا کڑکتی بجلیوں کی آگ پر !!
ایک مٹی کے دیئے کا طنز اور کعبے کا طاق
نرم و نازک آبگینہ، اور پتھر سے مذاق
اس تمسخر سے مرے سینے میں لگ جاتی ہے آگ
قلعۂ شاہی کی جانب موڑ دیتی ہوں میں باگ
پھر تو جاتا ہے جدھر میرا جنونِ تند خو!
پشت پر ہوتی ہیں لاشیں، ہڈیاں ٹڈی، لہو
میرے گرد و پیش کی ہنگامہ خیزی الاماں
شور، غوغا، غلغلہ، فریاد، واویلا، فغاں

اللہ اللہ میرے دہشت ناک خونی ولولے
آندھیاں، طوفاں تلاطم، سیل صرصر زلزلے
ابتری، دہشت، تنزلزل، طنطنہ، دہشت، فساد
دبدبے، گرمی، کشاکش، دغدغے، ہلچل، جہاد
کنگرے ایواں شاہی کے جھکا دیتی ہوں میں
جبر و استبداد کی چولیں ہلا دیتی ہوں میں!
دندناتی گنبد زریں میں گھس جاتی ہوں میں
چاٹ کر سونے کا پانی آگ برساتی ہوں میں
میرے خرق بے کلہ کے سامنے بے اختیار
کانپتا ہے طرۂ طرف کلاہ شہریار!
باندھ کر پیماں گدا کی خستہ سامانی کے ساتھ
کھیلنے لگتی ہوں ہولی خون سلطانی کے ساتھ
کس سے رکتی ہوں جب اپنی بات پہ آتی ہوں میں
سلطنت کے سر کا گودا تک چبا جاتی ہوں میں
زیردستوں کو دلا کر خونِ حاکم سے خراج
قیدیوں کے سر پہ رکھ دیتی ہوں آزادی کا تاج
شعلے کے مانند یوں لیتی ہوں پھر انگڑائیاں
سینۂ ارض و سما سے اٹھنے لگتا ہے دھواں

الاماں! میرا جنوں پر زہ تمرّد، الاماں!!
آ سنا دوں میں تجھے دو حرف میں یہ داستاں

جب ازل میں سجدۂ آدم کا اُٹھا تھا سوال
ہاں اسی ہلچل کے موقع پر کہ تھا وقت جلال

خود خدا سے برتر و قہار سے افلاک پر
کی تھی میں نے گفتگو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

رعبِ سلطانی سے یہ چہرہ اتر سکتا نہیں
جو خدائی سے لڑے، شاہی سے ڈر سکتا نہیں

سنہ ۱۹۳۲ء

زنداں کا گیت

آگیا وہ کوئی گلستاں لئے ہوئے
چہرے پہ رنگ صبحِ درخشاں لئے ہوئے
کلیاں ہر اک روش پہ چٹکنے لگیں تمام
گوہر فشاں نئے لبِ خواباں لئے ہوئے
نکلا فضا پہ صبح کا وہ نقرئی جلوس
گلبانگ طائراں خوش الحاں لئے ہوئے
فیضِ صبا سے مقدم صبح بہار میں
ہر خار و خس ہے جنبش مژگاں لئے ہوئے
یہ رنگ کیا ہے کشور ہندوستاں کا آج
ہر ذرۂ حقیر ہے بستاں لئے ہوئے!
یعنی ہر ایک ذرہ ہے خوں وفا سے سرخ
اور سرخیاں ہیں روضۂ رضواں لئے ہوئے
اس موج خوں سے دل میں نہ لانا کبھی ہراس
یہ موج خوں ہے لعل بدخشاں لئے ہوئے
اس ترک استبداد سے ہونا نہ بدحواس
یہ ترک ہے خروش فراواں لئے ہوئے

ان عصمتوں سے اہلِ دغا کی نہ ہو اداس
یہ عصمتیں ہیں جذبۂ عصیاں لئے ہوئے

گو ہند آج باغِ جہاں میں ہے مثلِ خس
یہ خار و خس ہے سنبل و ریحاں لئے ہوئے۔

ان جالیوں پہ مجلسِ تاریک کی نہ جا!!!
یہ جالیاں ہیں جنبشِ مژگاں لئے ہوئے

ان کروٹوں اہلِ قفس کی سبک نہ جان
یہ کروٹیں ہیں موجۂ طوفاں لئے ہوئے

ان ظلمتوں پہ مطلعِ امید کی نہ جا!
یہ ظلمتیں ہیں چشمۂ حیواں لئے ہوئے!

ظاہر میں بزدلی ہے یہ درماندگی مگر
یہ بزدلی ہے جنگ کا ساماں لئے ہوئے

آگاہ ہو نا تم! کہ یہ زمہریرِ صبر!
دل میں ہے عزمِ شعلۂ عریاں لئے ہوئے

آزادیوں کے دیکھ رہا ہے لطیف خواب
زندانیانِ عشق کو، زنداں لئے ہوئے

اے پیرِ خستہ! مژدہ کہ سنکی ہوا سے مصر
بوئے قمیصِ یوسفِ کنعاں لئے ہوئے

کہدو صدف سے آنکھ اُٹھائے ہوئے فلک
آیا ہے ابرِ قطرۂ نیساں لئے ہوئے

بزمِ بلقیس سے کہو کہ سرِ بارگاہِ ناز
پریاں کھڑی ہیں تختِ سلیماں لئے ہوئے

جوشؔ اہلِ دل کے پاؤں کی زنجیر بن گیا
یہ سلسلہ ہے زلفِ پریشاں لئے ہوئے

سنہ ۱۹۲۴ء

ہوشیار

آ رہی ہے نیند تجھ کو درمیانِ کارزار
دیکھ وہ تیغِ عدو چمکی، خدارا ہوشیار
ہوشیار
اے مردِ غافل ہوشیار

خوں کے دھارے کے اندر سے ہے جھنکار استہ
آنسوؤں کے سیل میں تو ڈھونڈتا ہے وہ دیا
ہوشیار
اے مردِ غافل ہوشیار

آرہی ہے دستِ استبداد سے بادِ سموم
اور محکومی سمجھتی ہے نسیم خوش گوار
ہوشیار
اے مردِ غافل ہوشیار

تن سے رخصت ہو رہی ہے روحِ مزدورِ ضعیف
حلق پر رکھا ہوا ہے خنجر سرمایہ دار
ہوشیار
اے مردِ غافل ہوشیار

جانوریں سانس یک رنگی و آزادی کے ساتھ
نوعِ انساں، اور تقسیم غلام و شہریار
ہوشیار
اے مردِ غافل ہوشیار

ضعف و قوت میں توازن ہو یہ ممکن نہیں
پھول سے گلچیں کا پیمان ہے نا استوار
ہوشیار
اے مردِ غافل ہوشیار

رحم کی درخواست سے پہلے یہ دل میں سوچ لے
خون ہے خادم کا آتلِ گلستاں کی بہار
ہوشیار
اے مردِ غافل ہوشیار

گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں
آدمی کا آدمی کرتا ہے اکثر یوں شکار
ہوشیار
اے مرد غافل ہوشیار

دیکھتا ہوں عصر حاضر کی نگاہ زہر میں
وہ دہکتی آگ کا نپیں جس سے دوزخ کے شرار
ہوشیار
اے مرد غافل ہوشیار

عرصۂ عالم کا ہر ذرہ ہے میدان عمل
بزم ہست و بود کا ہر ذرہ ہے روز شمار
ہوشیار
اے مرد غافل ہوشیار

۱۹۳۰ء

ایک شہیدِ وطن کی یاد میں

اے بہادر! اے شہیدِ خنجرِ ارباب کیں
جانِ جو اس شان سے دیتا ہے مر سکتا نہیں
پڑ رہی ہے اس طرف گردن میں پھانسی کی گرہ
کھل رہا ہے اس طرف آغوشِ فردوسِ بریں

نوجوانو، توڑ ڈالو سبحۂ و زنار کو
تا کجا یہ احمقانہ دار و گیرِ کفر و دیں؟
نوجوانو! عشق کو درکار ہے مجنوں کا دل
تابہ سکے یہ عشوہ ہائے لیلئ محمل نشیں؟

نوجوانو! خون، جینے کے لئے تھوڑا سا خون
خوں کی پیاسی ہے مدت سے وطن کی سرزمیں
پوچھے اب تم سے اگر کوئی کہ "ہیں جانیں عزیز"
یک زباں ہو کر پکار اٹھو "نہیں، ہرگز نہیں"

۱۹۳۰ء
لکھنؤ

لمحۂ آزادی

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی، ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر، غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

سنہ ۱۹۲۱ء

بزمِ باقی

چونک رہ اے دل، کہ ابھی تک ہے یہ محفل باقی
یہی محمل ہے اور یہی رونقِ محمل باقی !!

اب بھی ہر چیز ہے آئینۂ رخسارِ حبیب
اب بھی ہر شے ہے یہاں ناز کے قابل باقی

اب بھی ہر دل پہ ہے اس کاکلِ شبرنگ کا دام
اب بھی ہر روح میں ہے شورِ سلاسل باقی

آج تک کشمکشِ عشق کا محکم ہے نظام
وہی ناخن ہے وہی عقدۂ مشکل باقی

سن کہ ابتک ہے بیاباں میں جرسِ گرمِ فغاں
اٹھ کہ، ابتک ہیں بہت واقفِ منزل باقی !!

ذرہ خاک کو جو مہر بنا دیتا ہے
آج بھی تجھ میں ہے وہ جوہرِ قابل باقی

راہ کو منزلِ مقصود سمجھنے والے
جانتا ہے ابھی کتنے ہیں مراحل باقی

غور کرنے سے الجھتا ہے ترا دل، ورنہ
اب بھی ہے کشمکشِ حلِّ مسائل باقی!!

دل میں جو آگ تھی، ہر چند پڑی ہے خاموش
پھر بھی ایک آنچ سی ہے متصلِ دل باقی!

تو نے سننے کی قسم کھائی ہے ناداں ورنہ
اب بھی گلشن میں ہے گلبانگِ عنادل باقی

تو نے کیا سوچ کے میاں میں رکھ لی تلوار
دیکھ اب تک ہے نزاعِ حق و باطل باقی

نبضِ ہستی کی دھمک، جوش ہو کیونکر محسوس
جو دھڑکتا تھا، وہ پہلو میں نہیں دل باقی

سنہ ۱۹۲۹ء

مستقبل کے غلام

یہ ہند کے سمن بر، شیریں کلام بچے
یہ گلعذار بچے، یہ لالہ فام بچے

بے وجہ شادمانی بشاش رہنیوالے
یہ موجِ خوشی پر ہنس ہنس کے بہنیوالے

یہ دہر کی دعا کو تاثیر دینے والے
یہ خوابِ زندگی کی تعبیر بننے والے

رہ رہ کے یہ فلک کی جانب ہمکنے والے
یہ شاخِ عمرِ نو کے تازہ چہکنے والے

یہ اینڈتے، مچلتے، بڑھتے ابھرنیوالے
یہ رنگِ تازہ نقشِ عالم میں بھرنیوالے

کس شانِ دلکشی سے پھرتے ہیں کھوئے کھوئے
یہ گنگناتے غنچے، یہ بولتے شگوفے

امواجِ زندگی پر الماس کے سفینے
شیرینیوں سے مملو، ذی روح آبگینے

فطرت نے دل سے چاہا ان کا لطیف ہونا
ذی ماہِ نو کی چاندی، پہلی کرن کا سونا

لیکن وطن کی حالت پیہم ڈرا رہی ہے
دل سے یہ روح فرسا آواز آ رہی ہے

اک دن ذلیل، وحشی، ان کے بھی نام ہونگے
اپنی ہی طرح اک دن یہ بھی غلام ہونگے

سنہ ۱۹۳۰ء

شریکِ زندگی سے خطاب

اے شریکِ زندگی! اس بات پر روتی ہے تو
کیوں مرا ذوقِ ادب ہے مائلِ جام و سبو
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ اہلِ خانقاہ
ڈاڑھیوں سے ہندیوں کو کر رہے ہیں رو سیاہ
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ مصنوعی صلوٰۃ
خم کئے دیتی ہے اپنے وزن سے پشتِ حیات
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ دشمن کا عتاب
تیری ہمجنسوں کی راہوں میں الٹتا ہے نقاب
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ ہے گرمِ نغاں
سبحہ و زنار میں جکڑا ہوا ہندوستاں !!
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ تیرے نونہال
بن رہے ہیں مغربی تہذیب سے رنگیں جمال
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ تھے جو شہسوار
آج ان لڑکوں میں ہے لیلیٰ و سلمیٰ کا نکھار

کس لیے اس پر نہیں روتی کہ ہندی نوجواں
کھو چکا ہے صف شکن اسلاف کی روحِ تپاں

کس لیے اس پر نہیں روتی کہ شمشیرِ وطن
بن چکی ہے بزمِ محکومی کی شمعِ انجمن !!

کس لیے اس پر نہیں روتی کہ ملت کا شباب
شیب کی ناوقت یورش سے ہے جویائے خضاب

کس لیے اس پر نہیں روتی کہ بیٹے کی جبیں
باپ کے ماتھے کی سی تابندگی رکھتی نہیں

چھوڑ کر چہرے کے دھبے آئینہ دھوتی ہے تو
میری درویشانہ خودداری پہ کیا کیا روتی ہے تو

۱۹۲۶ء

زمانہ بدلنے والا ہے

ستم شعار! یہ اندازِ ساحری کب تک — رہے گی گرمیِ بازارِ سامری کب تک

یہ درسِ امن کی ابلہ فریبیاں تاچند — یہ اشتہارِ کرم کی فسوں گری کب تک

یہ بزمِ عیش یہ آہنگِ خسروی تا کے — یہ سازِ کیف یہ گلبانگِ قیصری کب تک

یہ فخرِ کنگرۂ قصرِ برتری تاچند!! — یہ رعبِ طرۂ دستارِ سروری کب تک

یہ کافرانہ نگاہ خدارسی تا کے
یہ بزدلانہ ادائے سپہ گری کب تک

یہ ٹلنے پہ تحکم، یہ دبدبے تا چند
یہ نادری، یہ خدائی، یہ قاہری کب تک

یہ شغل ظلم، یہ آئین دلدہی تا کے
یہ مشق جور، یہ انداز دلبری کب تک

یہ چیرہ دستی تشبث ناروا تا چند
یہ فتنہ خیزی توجیہ آذری کب تک

یہ شیطنت پس نمود ہمہ بدی تا کے
پیمبری میں یہ اندازِ داوری کب تک

ٹھہر کہ چرخ نئی چال چلنے والا ہے
سنبھل سنبھل کہ زمانہ بدلنے والا ہے

۱۹۲۵ء

مستقبل

مژدہ اے دل! کہ نیا اب سر و ساماں ہوگا
جس کو دشوار سمجھتا ہے وہ آساں ہوگا

ایک بار اور صبا لائے گی پیغام وصال
ایک بار اور علاج غم دوراں ہوگا

ایک مبہم سا نشان ہوگا نشانِ آلام
ایک بھولا سا فسانہ غم دوراں ہوگا

سنگریزہ کہ سرِ خاک پڑا ہے خاموش
گادشِ مہر سے کل لعلِ بدخشاں ہوگا

رو کشِ دشت دجبل قصرِ سلاطیں ہوں گے
ہمسرِ بامِ فلک کلبۂ دہقاں ہوگا

قدمِ فقر پہ جھک جائے گی شاہی کی جبیں
دستِ افلاس میں دولت کا گریباں ہوگا

خوفِ صیاد سے جو بھول چکا ہے پرواز
کل وہی مرغِ قفس مرغِ سلیماں ہوگا

پک رہا ہے جو بیاباں کی کڑی دھوپ میں آج
کل اسی سر کے لئے تاجِ گلِ افشاں ہوگا

آج جو دوب کا اک ریشہ ہے، اور کچھ بھی نہیں
کل وہ تلوار کی صورت میں نمایاں ہوگا

آج جس بزم پہ طاری ہے جلالِ فرعون
کل وہیں دبدبۂ موسیٰ عمراں ہوگا

آج جس رعب سے ہے روئے امارت پہ شکوہ
کل وہ مزدور کے چہرے سے نمایاں ہوگا

حکمِ ساقی سے ہے جو حلقہ بیرونِ در آج
کل وہی بزم میں رقصاں و غزلخواں ہوگا

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد
عالمِ پیر دگر بار جواں خواہد شد
(حافظ)

سنہ ۱۹۲۹ء

اللہ کرے

اللہ کرے اے ہند! اس فتنۂ دوراں میں
ہو گوئے ظفر مندی تیرے خم چوگاں میں
کانٹوں کو بناتی ہے جو بادِ صبا گلشن
آئے وہ صبا تیرے اجڑے ہوئے بستاں میں

دل ملتے ہیں جس مے سے معبود وہ مے ٹپکا
پیمانۂ ہندو میں، مینائے مسلماں میں
دانوں کو چٹکتے ہیں سینے میں جو شاعر کے
وہ عقدہ کشا غنچے مہکیں ترے داماں میں

اوراق سے اڑ جائیں اغیار کی تحریریں
اب مہر تری جھلکے ہر دفتر دیواں میں
ہاں نوح کی کشتی کی تقدیر ملے تجھ کو!!!
اس بحر سیاست کے بپھرے ہوئے طوفاں میں

اے طاق وطن! تجھ میں اے کاش پر افشاں ہو
وہ نور کہ غلطاں تھا قندیل سلیماں میں!!

اے کاش کبھی تیری ظلمت کی طرف دیکھے
وہ شمع کہ روشن ہے عشرت گہ یزداں میں

ساقی کے تبسم سے، اور جوش کے ہر بیت سے
روشن ہوں کنول تیری محراب زرافشاں میں

سنہ ۱۹۳۰ء

وطن[1]

اے وطن! پاک! روحِ ردانِ احرار!
اے کہ ذروں میں ترے بوئے چمن، رنگ بہار
اے کہ خوابیدہ تری خاک میں شاہانہ وقار
اے کہ ہر خار ترا روکشِ صد روئے نگار

ریزے الماس کے، تیرے خس و خاشاک میں ہیں
ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تری خاک میں ہیں

پائی غنچوں میں ترے، رنگ کی دنیا ہم نے
تیرے کانٹوں سے لیا درسِ تمنّا ہم نے

---

[1] میں تمام نوعِ انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں۔ وطنیت کے اس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری، منافرت اور ابن آدم کی تقسیم چاہتا ہے انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں لیکن اس قدر وطنیت میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کے تسلط سے محفوظ رکھا جائے۔ (مصنف)

تیرے قطروں سے سنی قرأت دریا ہم نے
تیرے ذروں میں پڑھی آیت صحرا ہم نے

کیا بتائیں کہ تری بزم میں کیا کیا دیکھا
ایک آئینے میں دنیا کا تماشا دیکھا

تیری ہی گردنِ رنگیں میں ہیں باہیں اپنی
تیرے ہی عشق میں ہیں صبح کی آہیں اپنی

تیرے ہی حسن سے روشن ہیں نگاہیں اپنی
کچھ ہوئیں تیری ہی محفل میں کلاہیں اپنی !

بانکپن سیکھ لیا عشق کی افتادوں سے
دل لگایا بھی تو تیرے ہی پری زادوں سے

پہلے جس چیز کو دیکھا، وہ فضا تیری تھی
پہلے جو کان میں آئی، وہ صدا تیری تھی

پالنا جس نے ہلایا، وہ ہوا تیری تھی
جس نے گہوارے میں چوما، وہ صبا تیری تھی

اولیں رقص ہوا مست گھٹائیں تیری
بھیگی ہیں اپنی مسیں آبِ ہوائیں تیری

اے وطن! آج سے کیا ہم ترے شیدائی ہیں
آنکھ جس دن سے کھلی، تیرے تمنائی ہیں

مدتوں سے ترے جلووں کے تماشائی ہیں
ہم تو بچپن سے ترے عاشق و رسوائی ہیں

بھائی طفلی سے ہر اک آن جہاں میں تیری
بات تتلا کے جو کی بھی تو زباں میں تیری

حسن تیرے ہی مناظر نے دکھایا ہم کو
تیری ہی صبح کے نغموں نے جگایا ہم کو
تیرے ہی ابر نے جھولوں میں جھلایا ہم کو
تیرے ہی پھولوں نے نوشاہ بنایا ہم کو

خندۂ گل کی خبر تیری زبانی آئی!
تیرے باغوں میں ہوا کھا کے جوانی آئی
تجھ سے منہ موڑ کے ہم اپنا دکھائینگے کہاں
گھر جو چھوڑینگے پھر چھاؤنی چھائینگے کہاں
بزم اغیار میں آرام یہ پائینگے کہاں؟
تجھ سے ہم روٹھ کے جائیں بھی تو جائینگے کہاں
تیرے ہاتھوں میں ہے قسمت کا نوشتہ اپنا
کس قدر تجھ سے بھی مضبوط ہے رشتہ اپنا

اے وطن! جوش ہے پھر قوت ایمانی میں
خوف کیا دل کو، سفینہ ہے جو طغیانی میں
دل سے مصروف ہیں ہر طرح کی قربانی میں
محو ہیں جو تری کشتی کی نگہبانی میں!!

غرق کرنے کو جو کہتے ہیں زمانے والے،
مسکراتے ہیں تری ناؤ چلانے والے

ہم زمیں کو تری ناپاک نہ ہونے دینگے
تیرے دامن کو کبھی چاک نہ ہونے دینگے
تجھ کو، جیتے ہیں تو، غمناک نہ ہونے دینگے
ایسی اکسیر کو یوں خاک نہ ہونے دینگے

جی میں ٹھانی ہے یہی، جی سے گزر جائیں گے
کم سے کم وعدہ یہ کرتے ہیں کہ مر جائیں گے

۱۹۱۸ء

شکست زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آکر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

کیا ان کو خبر تھی، زیر و زبر رکھتے تھے جو روح ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مار سیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں

کیا ان کو خبر تھی، سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

کیا ان کو خبر تھی، ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

سنہ ۱۹۴۱ء

علی گڑھ کالج کی پنجاہ سالہ جوبلی

یہ نہ پوچھو کہ ہم نے کیا دیکھا !!
جوبلی میں وہ ماجرا دیکھا !

قوم سے جس نے کر دیا بیزار
بن گئے ہم تو نقش بر دیوار

اتنے پیر دیئے نظر آئے
اپنی آنکھوں میں اشک بھر آئے

پوششیں مغربی اماموں کی
صورتیں مشرقی غلاموں کی !

پینٹ میں ہاتھ اور منہ میں سگار
شانے ہلتے ہوئے دم گفتار

طاق دل میں چراغ انگریزی
سر کے اندر دماغ انگریزی

چال انگریزی ڈھال انگریزی
جسم کا بال بال انگریزی

جسم ہندی میں جان انگریزی
منہ کے اندر زبان انگریزی

گفتگو میں بنی ہوئی آواز ؟ !
خم گردن میں مغربی انداز ؟ !

اپنے لہجوں سے ہاتھا پائی تھی !
حلق کی ساخت سے لڑائی تھی

چھل رہا ہے گلا تو چھل جائے
لہجہ "صاحب" سے ہو بہو مل جائے

جوش پنجاہ سالہ جوبلی کا !
آپ سمجھے کہ مدعا کیا تھا ؟ !

یہ جتنا تھا، دیکھو بڑھ گئے ہم
سوئے نصرانیت بہ پاس قدم

آج گم ہر طرف ہے توانائی دھواں

داعیِ برسعیِ سید احمد خاں   سنہ ۱۹

علی گڑھ سے خطاب

اے علی گڑھ، اے جوانِ قسمتِ دبستانِ کہن
اے کہ شمعِ فکر سے تابندہ تیری انجمن!

تیرے پیمانوں میں لرزاں ہے شرابِ علم و فن
حشر کے دن تک پھلا پھولا رہے تیرا چمن

مشعلِ سینا سے روشن تیرا میخانہ رہے
رہتی دنیا تک ترا گردش میں پیمانہ رہے

ایک دن ہم بھی تری آنکھوں کے بیماروں میں تھے
تیری جنسِ علم و ہنر کے خریداروں میں تھے

تیری زلفِ خم بخم کے ہم گرفتاروں میں تھے
تیرے اصنامِ سمن بر کے پرستاروں میں تھے

تیری برقِ جلوہ رنگیں پہ شیدا ہم بھی تھے
تیرے کوہِ طور کے اک روز موسیٰ ہم بھی تھے

لیکن اے علم و معارف کے درخشاں آفتاب
کچھ بہ انداز دگر بھی تجھ سے کرنا ہے خطاب!

گو یہ دھڑکا ہے کہ ہوں گا موردِ قہر و عتاب
کہہ ہی دوں جو کچھ ہے دل میں تا کجا تیری تاب

بن پڑے جو سعی اپنے سے وہ کرنا چاہیئے
مرد کو کہنے کے موقع پر نہ ڈرنا چاہیئے

اے علی گڑھ! اے ہلاک جلوۂ وضع فرنگ
"ٹیمز" ہے آغوش میں تیرے بجائے موج گنگ
ظلمت مغرب میں ہے آوارہ تیری ہر امنگ
ولولوں پر تیرے شاید عرصۂ مشرق ہے تنگ
آہ حیراں ہے وطن کا کارواں تیرے لئے
گوش بر آواز ہے ہندوستاں تیرے لئے

عاشق مغرب! لگاہ شرق کے جادو بھی دیکھ
اے سنہری زلف کے قیدی، سیہ گیسو بھی دیکھ
دیدۂ ازرق کے شیدا، دیدۂ آہو بھی دیکھ
ساز بے رنگی کے بندے! سوز رنگ و بو بھی دیکھ
"جسم" تاکے؟ "روح" لرزاں کے شرارے کو بھی دیکھ
"ٹیمز" سے منہ موڑ کر گنگا کے دھارے کو بھی دیکھ

پختہ کاری سیکھ، یہ آئین خامی تا کجا!!
جادۂ افرنگ پر یہ تند گامی تا کجا؟!
موج تو جی میں یہ جھوٹی نیک نامی تا کجا
مغربی تہذیب کا طوق غلامی تا کجا
مرد اگر ہے غیر کی تقلید کرنا چھوڑ دے
چھوڑ دے، للہ! بالاقساط مرنا چھوڑ دے

(ستمبر ۱۹۲۸ء)

مقتلِ کانپور

اے سیہ رُو، بے حیا، وحشی، کمینہ، بدگماں
اے جبینِ ارض کے داغ، اے دنیِ ہندوستاں

تجھ پہ لعنت اے فرنگی کے غلامِ بے شعور
یہ فضائے [illegible] پروردہ یہ قتالِ کانپور

تجھ کو عورت نے جنا ہے جھوٹ ہے اے لعیں!
آدمی کی نسل سے اور تو! نہیں، ہرگز نہیں

تیری جانب اُٹھ رہی ہے، دیکھ دوزخ کی نگاہ
صبح و شام رہیں جبکہ ہوئے دیو سیاہ

رودِ گنگا نے دیئے اس طرح طوفانِ حمات
کس کو کھا کر آ رہا ہے اژدہائے کائنات

اے درندے یہ اجیرا [illegible] ہوا
کس کا یہ گھر اُجڑا [illegible] ہوا

نوٹ: [illegible] ہنگامہ [illegible] فرنگیوں [illegible]

تیغ براں، اور عورت کا گلا، کیوں بد صفات!
چھوٹ جائیں تیری نبضیں، ٹوٹ جائیں تیرے ہات
کمینو پن سے یہ تری کیسا ٹپکتا ہے لہو؟
یہ تو ہے اے سنگدل! بچوں کا دامنِ مشکبو

مرد ہے تو اس سے لڑ، پہلے جو مارے، پھر مرے
تو نے بچوں کو چبا ڈالا، خدا غارت کرے
تو نے او بزدل! لگائی ہے بھڑکتی سی جیسے آگ
کیا نہیں ہاتھوں میں لیگا رخشِ آزادی کی باگ؟

دل ہی کیا کھوٹا! ان ارادوں میں ہا ہی نیت خراب!
اور یہ باطن! یہ عالم اور آزادی کا خواب!
سن کہ کم ظرفوں کو دے سکتی نہیں دنیا خراج
یہ ترا چھوٹا سا سر، اور ننگِ ہستی، اور تاج

اس طرح انسان، اور شدت کرے انسان پر
تف ہے تیرے دین پر، لعنت ترے ایمان پر
تو ابھرتے ہی زمانے کی نظر سے گر گیا!
یوں بہایا خون، امیدوں پہ پانی پھر گیا!

رکھتے ہی والا ہے آزادی کا جاں پرور جہاد
اے فرنگی اشادماں باشن وغلامی! زندہ باد

سنہ ۱۹۳۱ء

کب تک

رہے گی اہلِ جفا پر نظرِ عطا کب تک
بنے رہیں گے الٰہی! یہ بُت خدا کب تک

لئے رہے گا دکھانے کو [illegible] گلدستے
زبوں شعار حکومت کا اژدہا کب تک

کمندِ فکر میں اُلجھا کے ہنسنے والوں کو
زبانِ علم کہے گی گرہ کشا کب تک

کوئی بتاؤ یہ پیرانِ دامن آلودہ
بنے رہیں گے جوانانِ پارسا کب تک

کوئی بتاؤ کہ قبضے میں بادشہ کے!
رہے گا منصبِ تدبیر [illegible] کب تک

۱۹۳۱ء

غدار سے خطاب

ہوشیار اے صاحبِ غدار دامنِ قرآن
دیکھ آ پہنچا وہ اب بدلنا وقت آ گیا

دفن استحق رسیدہ پیدا ہوا رے بدنصیب
وہ اُٹھا کالا دھنگلی آ گیا سر کے قریب

بے وطن کا ہیچ و نکلی حکومت نہ ملک
ساتھیوں کو دے صدا بلائیے رستے پہ

خون لیا اپنے ہی تجھکو تو نعرہ اُٹھا
تو نے ہی پر ہے خون اے حلقہ شیطان کا!

قبر تیری ٹھوکریں کھاتی رہے گی حشر تک
پھول اپنے رو کر بیٹھی شرم ناخنوں کی پلک

روح تیری جانب نہ رد ول کر بیٹھی جب سفر
یادہ نور سے بجلیاں جھپٹیں گی تجھ کو دیکھ کر

تو پکارے گا کوئی حاکم مجھے آکر بچائے
ارعد گرجیگا کہ اب یہ بے حیا بچ کر نہ جائے

آسماں پہ بھی نہ دو بند ... پائیگا اماں
چاٹ لینے کو تجھے دوزخ لگائیگا زباں

انگلیاں اٹھیں گی دنیا میں تری اولاد پر
غافلہ ہو گا۔ وہ آتے ہیں رذالت کے بِسر

تیری مستورات کا بازار میں ہو گا قیام
معرضِ دشنام میں تیرا لیا جائیگا نام!

اس طرح منہ کر سے نہ تھوکے گا نہ کوئی نوجواں
بنت کی حسرت میں دہلیز پر، گھر کی کنواریاں

کیا بجا لوگوں کے غضب کا نشانہ ہوا ابن خطاب
اُٹھ گئے تیرا نام اچھل جائے گا یوں ڈھونڈنے کا خطاب

کسی تنہا بھی جلسہ نسلی محفلوں میں تیری داستاں
کانپ اٹھیں گی ذکر سے تیرے کنواری لڑکیاں

آہ! کاٹا جو تیغ کا جیسو فقط پنڈال میں قلم
قبر تیری سے اٹھے گی تو شبنم کی قسم

صبح تارہ بنجم ہر کا تیلی سے یوں تیرے نشاں
یتیماں جیسے رات کو ابلیس کی پرچھائیاں

تاج سے تیری وفاداری کی قسمیں بار بار
بھنبھناتی ہیں تیرے بے مروتوں کے تیز اعجاز کار

دم گھٹا جاتا ہے میرا دُور ہٹ اے تیرہ دل
تیرے منہ سے جھوٹ کے آتے ہیں بھبکے منفعل

تجھ سے بدتر دانش گراں اب جہاں میں صرف ملت کے زعیم
جان لو وقت کہیں تم کو سمجھتے ہیں لئیم

تجھسے نفرت کی کھٹک دونوں کی آنکھوں میں عیاں
قہقہہ ہے اُنکے لب پر، اور رنگ دل میں نہاں

بزدلی ڈالے ہوئے تاریک چہرے پر نقاب
دیر سے تیرے خمِ ابرو پہ ہے عزمِ خطاب

تیری پلکوں سے شقاوت کا دھواں ہے آشکار
ان بھوؤں کے سائے میں ہے حبِّ ملّت کا مزار

بزدلی ہے رخ پہ بکھرائے ہوئے سا زلفِ لیڈری
تیرے ماتھے کی شکن میں لے رہی ہے کروٹیں

تیری چشمِ تنگ کی گردش میں، اے ننگِ وطن
سو رہا ہے دردِ قومی دیر سے اوڑھے کفن

قوم کا دل ہے ترے ہونٹوں کے اندر پاش پاش
دوش پر ہے تیرے لہجے کی تری غیرت کی لاش

ہو چکے ہیں مشورے تیری فنا کے واسطے
جاگ اُٹھ، اب بھی سویرا ہے خدا کے واسطے

سنہ ۱۹۳۰ء

خریدارِ تو بن

اے دلِ آزادیٔ کامل کا سزاوار تو بن!
پہلے اس کاکلِ پیچاں کا گرفتار تو بن

یوں تو صبحِ رخِ محبوب نہ ہوگی طالع!
پہلے اے دیدۂ دل! دیدۂ بیدار تو بن

چشم بر راہ ہے شیرینیٔ صد آبِ حیات
تلخیاں پی کے سمائے شایانِ لبِ یار تو بن

اولیں شرط ہے ہر جنگ میں احساسِ خودی
فتح خود پاؤں پہ جھک جائیگی خوددار تو بن

یوں بھڑکنے سے رہا شعلۂ عزمِ منصور
پہلے پروانۂ شمعِ رسن و دار تو بن!

خود ہی چھٹ جائیگا گردوں سے ترے ابرِ خمار
ہم نشیں! خلوتیٔ ساقیٔ سرشار تو بن

قبضۂ یار میں رہنے کو اگر ہے بے چین
عرصۂ دہر میں چلتی ہوئی تلوار تو بن

آشیاں خود سے بنا دیگی مشیت تیرا
فصل تو آنے دے، بجلی کا خریدار تو بن

۱۹۳۱ء

خریدار نہیں

چونک جا خواب سے اے صیدِ زبونِ اغراض
عنصرِ بیتاب میں یوں نقش بدیوار نہیں
عشق میں گو دل بیمار ہے سب کچھ لیکن
نرگسِ ازرقِ جاناں سی بیمار نہیں!
بہرِ خوشنودیٔ اغیار یگانوں کو نہ چھیڑ
اپنے ہی سر پہ جو چلتی ہے وہ تلوار نہیں
تختۂ عزم سے کر سدِّ سکندر تعمیر!
یا ہمی جنگ سے گرتی ہوئی دیوار نہیں
بیٹھکیاں باغ میں سرگرم ہیں اُن پتوں کی
چمنستانِ جہاں میں گلِ بے خار نہیں
توڑ اس جال کو جکڑے ہے جو بازو تیرے
بستۂ کشمکشِ سبحہ و زنّار نہیں!
اہلِ بازارِ دنائت سے سروکار نہ رکھ
جانچ مسئلۂ اندک و بسیار نہیں!
پست سے پست ہو جو چیز وہ بنجا لیکن
مرے بھی جنسِ غلامی کا خریدار نہیں

۱۹۳۲ء

ہمت

وہ خسروانِ ایراں و مشیرِ دانا امرے
نقشِ قدم تھے جن کے ایرانیوں کے معبد
گردوں پہ موجزن تھا جن کا بلند پرچم
تاروں پہ خندہ زن تھے جنکے نقوشِ مسند
سورج پہ طعنہ زن تھے جنکی محل کے قبّے
کرسی سے تھے صف آرا جنکے قصور گنبد
شاہ و رضا کے پایا مسند پہ انکی قبضہ
شاہ رضا کہ جس کے گمنام ہیں اب و جد

"بر تختِ جم کہ تاجش محرابِ آفتاب است
ہمت نگر کہ موری با آں حقارت آمد"

(حافظ)

زندہ مُردے

کیا ہوا؟ کیا ہند کی حالت — ایک عالم ہے "دنی" "اقتریہ ثبات"
خواہ کچھ ہو اثر نہیں لیتے — اس طرح مر چکے ہیں احساسات
یا تو یہ "سائے" ہیں "بہ شکلِ بشر"
یا یہ "مُردے" "پا چکے" یہ قیدِ حیات

شملہ ۱۹۳۶ء

دامِ فریب[1]

سحر ہوتے ہی میخانۂ رندانہ — کہا یوں چشمِ ساقی نے فسانہ
کہ اے رندانِ دیر و حرم! چونکہ — زمیں سے تا فلک ہے آستانہ
تجھے رسموں سے ہو کیا رستگاری — ترا ایمان تو ہے اک فسانہ
ترا صیدِ زبونِ بزمِ ہستی! — ڈرا لے لا مکاں سا ہے آشیانہ
تجھے قطرے کا ہے اپنے بھروسا — تو اک دریا ہے ناپید اکرانہ

---

[1] سائمن کمیشن کے موقع پر یہ نظم کہی گئی تھی۔

کہاں تک اے سکوتِ بے نوائی؟ | کہاں تک یہ جمودِ عامیانہ
تجھے ہے موت کا ڈر، موت کیا ہے | حقیقی زندگانی کا بہانہ
ہمیشہ سے ہے زد میں بجلیوں کی | شکستہ زندگی کا آشیانہ
کہیں ہے دھوپ سے نادان بدتر | غلامی کی گھٹا کا شامیانہ
جہاں میں کچھ نہ رہ جائے گا باقی | مگر آزادیٔ یک سرزمیں کا فسانہ
جگانا ہے اگر سینے میں دل کو | تو ہے تیرا رہِ سعادت کا نشانہ
لگی ہے گھات میں مدت سے تیری | فرنگی کی نگاہِ صیادانہ
عدو تیری گرفتاری کی خاطر | مہیا کر رہا ہے آب و دانہ
اگر جینا ہے آزادی سے تجھ کو | سنا دشمن کو بڑھ کر یہ ترانہ

"برو این دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ"

(حافظ)

رعبِ حکومت

اک فرنگی معتبر نے پیار سے | سانس اپنا جو تھا چھٹ دنفعوار
بید کو ٹیکتا جو ٹٹ سلگائے | اک طرف جید بانغدار اشعو ٹرائے
سامنے سے مثالِ پیلِ دمان | ہندو آ رہا تھا مگر ہراساں

رخسارہ! چمن نمونۂ سہراب   رخ پر امواجِ عنفوانِ شباب
دونوں آئے قلب جیسے ہی!   ہٹ گیا ڈر کے اک طرف، ہنستا

خون رو خون، اے دلِ محروم
دیکھ لے فرقِ حاکم و محکوم!

ناخدا کہاں ہے؟

خبر لو آسودگانِ ساحل! کہ سامنے مرگ ناگہاں ہے
چھڑی ہوئی ہے دبیر سے یزداں زلزلوں عذاب کے درمیاں ہے

تمام دنیا غرق غرق ہے، تمام ہستی رواں دواں ہے
حقیر تنکے کی طرح کشتی کبھی یہاں ہے کبھی وہاں ہے

کوئی خدا کے لیے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟

غضب کے گرداب پڑ رہے ہیں، عظیم طوفان زور پر ہے
بلا کی پُرزور آندھیاں ہیں، جلال میں روحِ بحر و بر ہے

تھپیڑے کھاتا ہوا سفینہ کبھی ادھر ہے کبھی ادھر ہے
ہوا اٹھاتے ہوئے ہے طوفان، اگلتا شعلے ہوئے زباں ہے

کوئی خدا کے لیے بتا دو کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟

ہواؤں کی سنسناہٹیں ہیں، سیاہ موجوں کے تھپیڑے
ادھر سفینہ بہ رہا ہے وہ تلاطم کہ غرق کر دے ہزار بیڑے
بلا سی ہمالیہ کے طمانچے، غضب ہیں طوفان ور تھپیڑے
کڑک کی زیرِ نگیں زمیں ہے گرج کے قبضہ میں آسماں ہے
کوئی خدا کیلئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے ؟

بھرا ہوا غیظ میں سمندر فضا کی جانب ہمک رہا ہے
گرج، کڑک ہے، کڑک چمک ہے، چمک ہوا ہے، ہوا گھٹا ہے
چھنن چھنن ہے، گھرر گھرر ہے، گھنن گھنن ہے، دنا دنا ہے
فلک کے ہونٹوں پہ الحفیظ ہے، زمیں کے لب پر الاماں ہے
کوئی خدا کیلئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے ؟

ڈراؤنی رات رو رہی ہے، بھرے ہوئے ہیں تمام جل تھل
بھنور نکالے ہوئے ہے آنکھیں، جھکے ہوئے ہیں سیاہ بادل
ہوا میں شورش، گھٹا میں غوغا، فضا میں زلزلہ، زمیں ہلاچل
تمام گیتی ہے پارہ پارہ، تمام گردوں دھواں دھواں ہے
کوئی خدا کیلئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے ؟

سلام لو اے عزیز یارو! کہ اب نہیں شکل زندگانی
کہا سنا معاف کر دو، بھلا دو باتیں نئی پرانی ! !
بڑھو کہ وہ جھک چلا سفینہ، اٹھو کہ آنے لگا وہ پانی
مبارک اے جنگِ کفر و ایماں! حیات دم بھر کی میہماں:
کوئی خدا کیلئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے ؟

۱۹۲۵ء

ضعیفہ

اک ضعیفہ راستے میں سو رہی ہے خاک پر!
مُردنی چھائی ہوئی ہے چہرۂ غمناک پر!

اور کس موسم میں، جب طاعون ہے پھیلا ہوا
ذرہ ذرہ ہے وبا کے خوف سے سمٹا ہوا

رات آدھی آچکی ہے، بام و در خاموش ہیں!
اہلِ دولت لیلیٔ عشرت سے ہم آغوش ہیں!

اس قیامت کی ہے طاری ظلمتِ ہول آفریں
شب کے دل میں صبح کا گویا تصور تک نہیں

پیچھے پیچھے آ رہا ہے کون؟ یہ کیا بات ہے؟
بج رہے ہیں کان، اُف کیسی بھیانک رات ہے

حلقۂ ظلمت میں ہے راہوں کی سہمی روشنی
یا چمکتی ہیں گھنی جھاڑی سے آنکھیں شیر کی!

لرزہ بر اندام ہے صحنِ زمیں کا عرض و طول
ہو رہا ہے خاک پر ناپاک روحوں کا نزول

آ رہی ہیں آسماں سے یہ صدائیں دم بدم!
دیکھ اسبابِ ہلاکت پر نہ پڑ جائے قدم!

بام و در پر موت کا پرچم ہے لہرایا ہوا
آ رہی ہے ہر قدم پر بوئے انفاسِ وبا
دیکھیے سارے کھڑے ہیں سانس لینا ہے وبال
الاماں شورِ سگانِ نالہ و غوغائے شغال
اُف لرزتی خوفناک آواز "چرکیدانہ" کی !
نبض چھوٹی جا رہی ہے تندیٔ دخار کی !
ہچکی ہچکی سانس لینے سے گھٹا جاتا ہے دم
دیکھ رہا ہوں بولتے ذرّوں پہ رقصاں گردِ غم

عبرت و دہشت کا خنجر ہے دلِ غمناک پر!
ہائے یہ بے دم پڑا ہے کون ٹھنڈی خاک پر!
آہ اے بیکس ضعیفہ! غم کی تڑپائی ہوئی
اے زمانے کی جھنجھوڑی، زندگی ٹھکرائی ہوئی
میرے دل کے آئینہ کو کر رہا ہے چُور چُور!
تیرے سر پر رہگذر کی شمع کا ہلکا سا نُور!

یہ ترے سر کی سفیدی، اور یہ گردِ ملال!
میں تو کیا، شرما رہا ہے خود خدائے ذوالجلال
بھوک کے لشکر کا ہے رُخ پر ترے گرد و غبار
عہدِ رزاقی کے ماتھے پر عرق ہے آشکار
تیرے بچّے، تیرے گرد و پیش کے سارے کیا ہوئے؟
اے ضعیفہ! تیری پیری کے سہارے کیا ہوئے؟

آہ اے دکھیا ! یہ کیسی پائمالی ہو گئی
ٹھوکریں کھانے کو تیری خالی ہو گئی !

سو رہا ہے تیرا لاشہ کس طرف پہنے کفن ؟
دفن ہے کس دیس میں تیرا عروسی بانکپن ؟

بزمِ عشرت میں دلہن کس نے بنایا تھا تجھے ؟
بیاہ کر کون اپنے گھر میں آہ لایا تھا تجھے ؟

خون ترا دوڑتا ہوگا تیری آواز سے
تجھ کو پالا ہوگا تیری ماں نے کس کس ناز سے

ڈالتی ہوگی تجھے نہلا دھلا سر میں تیل !
باپ کا دل کھینچتا ہوگا تری گڑیوں کا کھیل

یاس کی تاثیر کیسی چہرے پہ ذوقی ہو گئی !
مائکا ویران ہوا، سسرال سونی ہو گئی !

چاہنے والے ترے سب تربتوں میں سو گئے
کھیلتی تھی جن گھٹنے باغوں میں وہ کیا ہو گئے

اُف ری مایوسی کسی کا آسرا رکھتی نہیں !
شبہ ہوتا ہے کہ تو شاید خدا رکھتی نہیں !

تو کہاں کی رہنے والی ہے، ترا کیا نام ہے !
یوں، تو کس دلنشیں آغاز کا انجام ہے !

ہند میں انسانیت کا ذرہ بھی باقی نہیں
درد ہو سکتا دنی مر رہی باقی نہیں

یہاں آداب نہ رکھتے بیکسوں کا احترام
مرا بل بستے تو رہا مکتے قیدی یوں بنکر غلام؟

خدمتِ اغیار سے فرصت کوئی پاتا نہیں
سچ ہے اپنوں پر غلاموں کو ترس آتا نہیں

امتحان وہ القا لگ ہے تو ملک و ملت کیلئے
قوم اما فصلہ و حسبا عبادیٔ اہلِ دولت کیلئے

اک کھلی ذلت ہے ادیان و ملل کے واسطے
طوق ہے لعنت کا تو اہلِ دول کے لئے

تو وعید قہر ہے ارباب عشرت کے لئے
برص کا اک داغ ہے روئے حکومت کیلئے

مجھ کو حیرت ہے کہ تجھ کو دیکھ کر زار و نزار
مر نہیں جاتے حیا سے حاکمانِ ذی وقار

دیکھ کر تیرا ڈھلا ڈھانچہ نہیں ہوتا ہے کچھ
گو دنوں کے ستم کو سختی بخشنے والا غرور

پھٹ نہیں جاتے الٰہی سینۂ دولت میں داغ
بجھ نہیں جاتے شبستانِ امارت کے چراغ

اپنی تاب نہ رہے اے سرمایہ والے ہوشیار
اپنے تاجوں کی چمک سے تاجدار و ہوشیار

نیلم و یاقوت سے شعلے بھڑک اٹھنے کو ہیں
سرخ دیناروں میں انگارے دہک اٹھنے کو ہیں
فرشِ گل والو! زمیں پر لوگ محوِ خواب ہیں
خرمنوں کے پاسبانو! بجلیاں بیتاب ہیں

۱۹۳۵ء

بوالعجبی

کل منہ اندھیرے صبح کو تالاب کے قریب
یاد آ رہا تھا دل کو خمِ کاکلِ حبیب
مس ہو رہی تھی قلب و جگر سے خنک نسیم
بوجھل سی تھی نرالی سی بھیگی ہوئی شمیم
جھونکے تھے اضطراب کا پہلو لئے ہوئے!
ہر دوب نرم دوب کی خوشبو لئے ہوئے
تھی مد و جزر آب کے اندر چھڑی ہوئی!
ٹھنڈی ہوا کے تند تھپیڑوں کی بن آگئی!

افسانہ کہہ رہا ہے شبِ تار جبر کا
نظروں سے اس طرف کا کنارہ چھپا ہوا

دھندلی ماندلیوں پہ گھٹاؤں کا تھا دھواں
گردوں سے آ رہی تھیں دبے پاؤں بوندیاں

چھایا ہوا تھا صبح کے ماتھے پہ رنگِ شام
اتنے میں اک کسان نے جھک کر کیا سلام

جاگے ہوئے لطیف خیالات سو گئے!
انبی نگاہ ار فرشتے سب جھجن سے ہو گئے

مزدوروں اور خفتہ دلوں کی تربت تمام
شاہ اور گدائے پادشہی کو نہیں الہام!

قوت کا . اور ضعف کے در پہ سر نیاز
محنت اٹھا رہا ادھر تھکی بیماریوں گداز

اف بجی زمین کے سامنے چہرہ سر پہ جھکے!
فلک کے آستاں پہ خدا کی جبیں جھکے:

بیچارگی کے ساتھ جھکا کے کریم سر
منعم ور بھیک مانگنے والوں کو دیکھ کر

بجھ دوں کے ڈر سے مالک گلشن ہو بیقرار
پچھے لوگوں نگراں تھے قحبہ سے گرے تھا لیتی بہار

در کھا کھٹاسے شاہ گدا اے حقیر کا
فولاد اور مار اُسے لوہا حقیر کا!

عقلِ سیاہ کار کی عزت کرے جنوں!
قدموں پہ بزدلی کے ہو تلوار سرنگوں!

ناطاقتی ہو کشورِ طاقت میں شہریار
ریشے کو اور برق بنائے سپاہ دار

مردانِ کوہ و دشت و دلیرانِ تند خو
عاجز ہوں دخترانِ تمدن کے روبرو

بارِ خدا! "یقین" ہو قربان "گمان" پر
لعنت ہو اس زمیں پہ، تُف آسمان پر

سنہ ۱۹۳۱ء

"خان بہادر" اور "شمس العلماء"

بڑھ رہی ہے بہادری کتنی!
جتنی کی دھوپ چڑھتی جاتی ہے

جس قدر "شمس" ہو رہے ہیں طلوع
تیرگی اور بڑھتی جاتی ہے

سنہ ۱۹۳۰ء

پیرزن

اک مس، مستوں کی لیڈی بصد انداز و ناز
دخترانِ ہند سے ہے دیکھ سرگرمِ نیاز
پھر رہی ہے لڑکیوں کی صف میں بل کھاتی ہوئی
ہاتھ میں کنگھی لیے، زلفوں کو سلجھاتی ہوئی

کچھ خبر بھی ہے تجھے ناواقفِ لیل و نہار
یعنی اس تزئینِ گیسو میں ہے کتنا خلفشار
کنگھیاں کی جا رہی ہیں کاکلِ شب گیر میں
پیچ ڈالے جا رہے ہیں ہند کی تقدیر میں

واں سلجھتے جا رہے ہیں گیسوئے عنبر شکن
یاں الجھتا جا رہا ہے عقدۂ اہلِ وطن
کام سے جس وقت یہ مشاطہ فرصت پائیگی
ہندیوں کے ہر بنِ مو سے لہو ٹپکائے گی

اس کا جوڑا ایک ناگن، اس کی کنگھی ایک جال
ناگ کالے ناگ سے بدتر ہے اس کا بال بال

اس کے ہاتھوں گندھ رہی ہیں جسقدر بھی چوٹیاں
ناگنیں بن جائینگی اک دن پئے ہندوستاں
بل کھا کر پھانس سینوں میں چبھو جائینگے کل!
ہاں یہ زنجیرِ پائے قوم ہو جائینگے کل!
مادرانِ دورِ مستقبل نہ ہو جائیں شکار
اس مشین اسکول کی ڈائن سے یارو ہوشیار
بادِ طوفانی ہوائے سرد بن کر آئی ہے
چھیر دن فرہاد کی ہمدرد بن کر آئی ہے

۱۹۲۹ء

حیف اے ہندوستاں !

غیرتِ ہمت گنوا رہی باہمی خونریزیاں !
دوپہر کی دھوپ سر پہ اور یہ خوابِ گراں
حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں

بے زروں کے چہرہ و تیرا آنکھوں میں فاقوں کے نقوش
اہلِ دولت کی جبینوں پر شقاوت کے نشاں
حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں

قائدانِ قوم و مکروہاتِ حبِ مال و زر !
شاعرانِ ملک و مفروضاتِ سود و زیاں
حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں

گو سفندوں کی سیادت میں ہو شیروں کی کچھار
بوم کے زیرِ نگیں ہا شہ باز کا ہو آشیاں
حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں

ابر بن بن کر برستی ہیں، خبر بھی ہے تجھے ؟
گلشنِ اعدا پر تیری باہمی خونریزیاں !
حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں

شور تھا تک دشمنوں کی موجوں کو خواب
آہ اسے بیگانہ انہ تھا اور خواب

حیف اے ہندوستان تیرا یہ وقار
رعبِ تیموری! کہاں جا کر رہا ہے تو اب
عزم گردانِ سفر تیرا وہ
حیف اے ہندوستان تو اور

بھوکا ہندوستاں

ایک مُفلس کے مکاں میں کل ہوا میرا گذر
خاک پر بیٹھا تھا بچہ، اور بیوی تخت پر
تخت اینٹوں کی کمی بیشی سے ناہموار تھا :
دونوں اک تازہ کسی عورت کا بھی جسم بار تھا

اے ترجمان بیکس پائمالِ صد جنوں
پھر اک طرف بیٹھا ہوا تھا سر نگوں!
گرد پیشانی پہ تھا چھایا ہوا دل تا دھواں
بس میں غلطاں تھیں شرافت کی تنک چنگاریاں
اس کی آنکھ لفظ سے تھی اس قدر نامعتبر
کیسے قہقہے جیتا لہجہ جس کے ظلم پر
تھا وہ یوں اعلا و جو کے پاس حل گرفتارِ قلق
ہر ایک دن تو تھا جیسے ہر منظر ہوا انکا نم
ملا دیا ہے انائیں بابیانی قرب کا ادب آداب
جب سے یہ دور جالوں نانچ اصلاحات شباب
اے میرا دل اساں جب ہوتا ہے یوں تڑپ تب ہم
پہچانے، آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر۔
اے دل درد رہ محبت نا ہوتا
دورہ مانوس کر دیتا ہمارا
اے اعزا سے پیش آتا ہے، تو مہربانی
اکتا بیٹھے جا، مانیں نکتہ تو بتا دیں
ٹھیک اور اسے مان سہا آخر پائمال
وہم سا آجاتا ہے تو وہاں شرافت تا نیال
میں اکیلا ہوں اور دوستی بنتا نہیں وہم
دکھی ہے دو یک جا پر دیتا الزام انکے قدم

جب زبوں دستہ جان انسان کا ذوقِ وفا
خلق کی نظروں میں بنتا ہے مدد کی التجا

زندگی ہوتی ہے جب اس درجہ عبرت آفریں
تخلیے کا دوست بھی ہو تو کبھی دیتے نہیں!

جب خزف معلوم ہوتے ہیں خود اپنے ہی گہر
وہم ہوتا ہے سکون کا خود اپنی وضع پر

رُخ پہ جب ہوتے ہیں ایسی خستہ حالی کے نشاں
جیسے "سچ پر جھوٹ" کا ہوتا ہے دُنیا کو گماں

اس مصیبت سے تھی اسکی زندگی زیر و زبر
جس مصیبت میں شرافت توڑ دیتی ہے پر

اس کے سر پر تھا تہیدستی کا وہ بارِ گراں
ٹوٹنے لگتی ہیں جس سے زندگی کی ہڈیاں!

مفلسی کے اس کنارے پر تھا وہ گرمِ خرام
ترک کر دیتا ہے بیٹا، باپ کا جب احترام

الغرض چھائی ہوئی تھی یاس سقف بام پر
روح تھرانے لگی میری یہ منظر دیکھ کر

گھر تھا یا اک داستانِ کھویا ہوا بھٹکا ہوا!
خفتہ تھی قسمت مکینوں کی، مکاں سویا ہوا

یہ مکاں اک قصرِ عالی کا تھا اک ایسا مقام
تھا جہاں کل اس کے آباء کا مرغ جہاں

جس طرف اس کا لڑکپن بھول کر جاتا نہ تھا
عہدِ طفلی میں جدھر یہ کھیلنے پاتا نہ تھا
جو مکاں کل نغمۂ خنداں سے پر جوش تھا
آج آفات کے آغوش میں خاموش تھا!
پوچھتا جاتا تھا لیکن، خیر سے تو ہیں مکیں!
مجھ میں اک مدت سے کوئی قہقہہ گونجا نہیں
طاق پہ رکھا ہوا تھا ایک سویا سا چراغ
طاق کے نیچے تھے گرد و تیل کے دو ایک داغ
تیل بہنے کا نشاں دیوار پر اصلاً نہ تھا
ایک دن بھی وہ دیا شاید کبھی چھلکا نہ تھا
اس حقیقت کو سمجھ سکتے نہیں اہلِ فراغ
اور ظلمت کو بڑھا دیتا ہے مفلس کا چراغ
سرد چولہے کے قریب اڑتا ہوا پھیکا غبار
الگنی پر چند کپڑے اور وہ بھی تار تار
جا بجا تھے پپڑیاں دیوار کی چھوٹی ہوئی
دھجیاں الگنی کی تھیں، انھیں بھی کچھ ٹوٹی ہوئی
ایک گوشے میں تھا بستر کے عیوض تھوڑا سا پیال
جس پہ دو ٹکڑے دری کے، اور اک صد پارہ شال
شال کے ہر تار میں خوابیدہ سو نقش و نگار
عہدِ ماضی کی یہی لے دے کے تھی اک یادگار

بچہ بہلا سا ہوا تھا خاک کے اک ڈھیر سے
ماں دوپٹہ سی رہی تھی سر جھکائے دیر سے
کھیلنے میں انہماکِ قلبِ خام تھا ڈوبا ہوا
آ گئی اتنے میں گلی سے آم والے کی صدا
کانپتی آئی صدا، ہلنے لگا بچہ کا دل! !
سانس لی یوں جیسے رکھی ہو کوئی چھاتی پہ سِل
ہو گئی اگلی صدوں کی یاد سے دنیا سیاہ
ماں کے چہرے کی طرف ڈال جھجکی سی نگاہ
ماں کی نظریں اٹھ گئیں، اٹھکر پھر بے بسی سے جھکیں
ہائے میرے لال! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں!
دیکھکر ماں کی اداسی ہو گئی پامال یاس!
اٹھکر یوں ہی آم کی شیرینی، تخیل میں مٹھاس
ہونٹ کانپے خود بخود، اور رہ گئے پھر کانپ کے
دل میں پھر چبھنے لگے اگلی صدوں والے تجربے
راستے میں آ گئی دیوار، نالے چڑھ گئے!
منہ میں تھرائی زباں، الفاظ آگے بڑھ گئے!
چھا گیا چہرے پہ سناٹا دلِ ناکام کا
"اشک" بن کر آنکھ سے ٹپکا، تصور آم کا!
چہرہ مرجھایا، نفس بوجھل سا کچھ ہونے لگا
دل کے جھنجھلانے میں بچپن کھو گیا، سونے لگا

نیم جاں ماں باپ کی نظروں کے تلے ملنے لگے
باپ کا سر اور دکھیا ماں کے لب ہلنے لگے!

آہ اے ہندوستاں! اے مفلسوں کی سرزمیں
اس کڑے پر کوئی تیرا پوچھنے والا نہیں!!

آہ اک دل ہی ترے افلاس پہ جلتا نہیں
اب تو اک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے ملتا نہیں

ہندو و مسلم نہیں اٹھتے تری امداد پہ
تف ہے ایسی بے حمیت ناخلف اولاد پہ!

ہائے کیا کرنا تھا ان کو، اور کیا کرتے ہیں یہ
گائے اور باجے پہ لڑنے کیلئے مرتے ہیں یہ

اس طرف ہے خوبیٔ قسمت سے باجا اور گائے
اس طرف افلاس کے مارے ہوؤں کی ہائے ہائے

ناخلف بچے تری جانب نظر کرتے نہیں!
ان کو جس میدان میں مرنا چاہئے مرتے نہیں

سخت ہو جاتی ہے اس سے ہر کڑی زنجیر کی!
مار کر اپنوں کو مرنا موت ہے خنزیر کی!

ان سے کہدو تا کجا بربادیاں؟ آباد ہو! ١
یا گلے خود کاٹ کر مر جاؤں، یا آزاد ہو!

آہ اے ہندوستاں! اے کشورِ زار و نزار
تیرے بچّے بھی بلکتے ہیں، جواں بھی بے قرار!
تیرے مُردوں کا کفن تک سے گئے چالاک چور،
شق ہوا ہے تاریک جیتے جاگتے مُردوں کی گور
تیرے اوپر آکے ٹھہرا ہے ٹھگوں کا قافلہ
جھوم کر، پیٹ، اے بھیا تک دبو! پیٹ اپنی ہلا
اے بھڑکتی آگ! ٹھنڈی راکھ کی تہ سے نکل
اے رگِ غیرت! اُبھر اے خون کے چشمے اُبل
گرد نیں طوقِ غلامی سے ہوئی جاتی ہیں کج!
اے کڑکتی برق! گر، اے جھومتے بادل گرج
تا کجا یہ خواب؟ اے ہندوستاں! آ ہوش میں
آج بھی ہیں سیکڑوں ارجن ترے آغوش میں
آرہی ہے کب سے رہ رہ کر صدائے انقلاب
زندہ ہے، تو اے وطن! دیتا نہیں پھر کیوں جواب
زندہ ہے تو، میری ہمت کو پرِ پرواز دے
وہم ہوتا ہے مجھے، آواز دے آواز دے
یہ اجل کی بے حسی ہے، یا فقط خوابِ گراں؟
بول اے ہندوستاں! ہندوستاں! ہندوستاں!

۱۹۳۰ء

نغمۂ قفس

آگ ہے لحنِ طائرِ آزاد!
خاک ہے طائرِ قفس کی لے
ہم صفیرو! گلے کی ساخت کو بھی
کیا اسیری بگاڑ دیتی ہے؟

سنہ ۱۹۳۷ء

بہتے ہوئے خوں کی برادری

مژدہ باد اے ایشیا! اے سرزمینِ زرفشاں
آ گئی وہ ساعتِ بیداریٔ ہندوستاں
مژدہ باد اے سرزمینِ ہند، اے جنت سواد!
میان سے باہر نکلتی ہی پہ ہے تیغِ سواد!

سرخ پرچم کھولنے پر ہے بغاوت کا جنوں
تیرے ذرّوں پر بہے گا ہند و مسلم کا خوں!
لیکن اس سے تو ہراساں ہو طلب انسانی کا او
خون کا سیلاب دستور بنا مغربانی عالمانہ و
رشتہ کٹ جاتا ہے بہتے خون سے اوہام کا!
خانہ جنگی غسلِ صحت ہے علیل اقوام کا
یاد رکھو جذبۂ غیرت میں جو غنی آ پلنے !!
خوں بہا تو ہند و مسلم کو بھی تمنی آ بلائے گا!
غنچۂ امید اربابِ وطن کھل جائے گا!
خاک پر بہتے ہی دونوں کا جگر مل جائیگا!

دھمکی

تو نے شاعر سے یہ اے غاصب حکومت کیا کہا
"تو نہ مانے گا مجھے تو قتل کر دوں گی تجھے"
قتل سے ڈر جاؤں گا، اتنا سمجھتی ہے ذلیل
جا، اور ایسی بعد قیانہ قسم کی دھمکی نہ دے!
۱۹۳۱ء

پیاسی ندی

اے برادر! پل پہ جب گنگا کے آجاتی ہے ریل
پھینکتا ہے کس لئے سکے، یہ کیا کرتا ہے کھیل
قوم کی آنکھوں سے جاری ہیں لہو کی ندیاں
ڈوبنے ہی پر ہے جن میں عزت ہندوستاں
کیوں نہیں کرتا ہے تو اس خوں کی ندی کا پاس
جس کو گنگا سے کہیں بڑھ چڑھ کے ہے سکوں کی پیاس
ڈوب کر گنگا میں اک ابھر سکتا نہیں
ہند کی آنکھوں کے آنسو خشک کر سکتا نہیں
کارآمد ہے جو آب زندگانی کی طرح
تو بہا دیتا ہے اس دولت کو پانی کی طرح
دیکھ کر تیری یہ نادانی، یہ کار ناصواب!
شرم کے مارے ہوئی جاتی ہے گنگا آب آب
باز دے زر! ناخدائی کے لئے طیار رہو
ڈوبنے والی ہے کشتی قوم کی ہوشیار رہو!
کی گئی ناوقت قربانی تو پھر کیا فائدہ؟
سر سے اونچا ہو گیا پانی تو پھر کیا فائدہ؟ ۱۹۳۱ء

بادشاہ کی سواری

پرے جمائے ادب سے اکڑے ہوئے ہیں سوار
سڑک پہ رعب ہے، جنبش میں ہیں در و دیوار
چلے تو کیسے چلے نبضِ کوچہ و بازار؟
ابل رہا ہے تحکم، برس رہا ہے وقار!
زمیں پہ چرخ سے تنویرِ ماہ آتی ہے؟
ہٹو، بچو کہ سواریٔ شاہ آتی ہے

سڑک ہے بند، پڑا ہے رکا ہوا ہر کام
نہ جانے کتنے گھروں میں بپا ہے اک کہرام
ہشار رہے ہیں غریبوں کو سلطنت کے غلام
برس رہے ہیں جو کوڑے تو گر رہے ہیں عوام
سواریٔ شہِ گردوں وقار آتی ہے
نویدِ رحمتِ پروردگار آتی ہے

"ارے یہ موڑ پہ تیورا کے کون شخص گرا؟"
"حضور! ساٹھ برس کی مریض اک بڑھیا"
اسے ہٹاؤ یہاں سے، یہ ہے شگون برا
لبوں پہ جان ہے، چلتا ہے سانس کا ڈورا

اسے ہٹاؤ کہ اس کا اثر بڑا ہوگا؛
جبین شاہ پہ بل پڑ گئے تو کیا ہوگا؛

سفید ہوگئیں آنکھیں، اکڑ چلا ہے بدن!؟
گلے میں سانس ہے، ڈھلنے ہی پر ہے اب گردن
حلال خور ہے کیا اپنی جان کا دشمن
اسے گھسیٹ کے، گھُورے پہ ڈال دے فوراً

جہاں پناہ غضب ناک ہو نہ جائیں کہیں
نگاہیں شاہ کی ناپاک ہو نہ جائیں کہیں
بگل بجا، وہ سواری شہریار آئی
خزاں کی رات گئی، صبح نوبہار آئی

خدا کا شکر کہ پھر باد مشکبار آئی
ادب سے "ساتھ" کی آواز بار بار آئی
فلک نے جان لیا، اور زمین مان گئی
کسی کی آئی سواری کسی کی جان گئی

سنہ ۱۹۳۰ء

انتباہ

ڈرو اس وقت سے اے دشمنانِ امن و آسائش
بنا لیں جب علم خوں ریز تلواروں کو ہم اپنی
کہ ان کا فیصلہ کچھ اس قدر دو ٹوک ہوتا ہے
کہ دو ٹکڑوں میں ذرہ بھر کمی بیشی نہیں ہوتی

سجاد سے

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

اے مری آنکھوں کے تارے اے مرے لختِ جگر
ہنس، کہ تیرے دم سے ہے فردوس، آغوشِ پدر
لیکن اے نورِ نظر، یہ دورِ عشرت جانے کو ہے
زندگی میں ایک دورِ تلخ بھی آنے کو ہے

یہ زمانہ طور سے بے طور ہو جائے گا کل
یہ زمیں، یہ آسماں، کچھ اور ہو جائے گا کل
اس ورق کو جب الٹ دے گی ہوائے انقلاب
تجھ پہ یعنی بند ہو جائے گا جب ہستی کا باب

میرے مرتے ہی چلے گی وہ قیامت کی ہوا!
پھیر لیں گے تجھ سے منہ، ظالم عزیز و اقربا!
گو، خدا کا شکر ہے، بھائی کوئی تیرا نہیں
تجھ کو، مادر زاد، دشمن کا کوئی کھٹکا نہیں

پھر بھی خونی اقربا کے صید ہوتے ہیں یتیم
بیکسوں کی آہ ہے ان کے لئے موجِ نسیم
لطف کے پردے میں کرتے ہیں یگانے پائماں
مہر کی نظریں، یتیموں کیلئے بنتی ہیں جا... !

جو چھڑکتے ہیں پسینے پر ترے خونِ جگر!
کل پسینہ بھی نہ ٹپکائیں گے تیرے خون پر!
باپ کے مرتے ہی ہو جاتی ہے دنیا خشمگیں
اس طلاطم میں زمیں برسوں جگہ دیتی نہیں

ہو چکا ہے اقربا کے ہاتھ میں پامال دیکھ
دور کیوں جاتا ہے، اپنے باپ ہی کا حال دیکھ
دیکھ، کیوں کر میرے دل کو پارہ پارہ کر دیا
مہر کو کچھ اس طرح توڑا کہ تارہ کر دیا

لیکن اس ہلچل میں ہو جاتا ہے جس سے جی نڈھال
عزّت دیرینۂ اجداد کا رکھنا خیال!

ہر نفس تیار رہنا ہر بلا کے واسطے!
صاحبِ سیف و قلم بننا خدا کے واسطے

ضعف ہے روزِ ازل سے تیرہ بختی کا شکار!
زورِ علم و قوتِ بازو ہے شانِ کردگار

دل ہے تسخیرِ قوائے بحر و بر کے واسطے
ناتوانی کفر ہے نوعِ بشر کے واسطے

قبر میں روحِ پدر کو شاد کرنے کے لیئے!
سرکشا یا ہند کو آزاد کرنے کے لیئے!

ہاں تو میں تجھ سے یہ کہنا تھا کہ اے جانِ پدر
جب مرا ہو جائے گا اس دارِ فانی سے سفر

رونے والوں کو مرے مرنے پر آجائیگا صبر
شہر سے باہر کسی گوشے میں ہوگی میری قبر

محو ہو جائے گی دل سے کلفتِ مرگِ پدر
وقت کے مرہم سے بھر جائیگا یہ زخمِ جگر

ہوں، جو ہونگے دلنشیں منظر، ترا نے بیبدل
ثبت ہوگی میری چشم و گوش پر مہرِ اجل

ہوں گی طالع کس قدر صبحیں بر انگندہ نقاب
میں نہ دیکھوں گا مگر تا حشر بیداری کا خواب
چاند اوجِ آسماں سے نور جب برسائے گا!
ساحلِ گل ریز پر مجھ کو نہ لیکن پائے گا!
بدلیاں برسات کی کیا کیا نہ ہوں گی بیقرار
میرے اجڑے باغ میں لیکن نہ آئے گی بہار
جائے گا آزاد میری شاعری کا دور دور
خاک کے پتھر سے ہوگا نطق میرا چور چور
یوں تو آتا ہے نہ اس دل میں تلاطم آئے گا
قبر پر تو آئے، تو لب پہ تبسم آئے گا
لیکن اے جانِ پدر! دنیا ہے وہ مضبوط جال
آدمی کا جس کے پھندوں سے نکلنا ہے محال
تو نئے ماحول میں اس وقت ہوگا غالباً
اور نئے احباب سے معمور ہوگی انجمن!
ہو سکے گی یاد بھی میری نہ بھولے سے مُخِل
کارِ ہستی میں ترا اس طرح لگ جائے گا دل
عہدِ پارینہ کو انساں وقت دے سکتا نہیں
آدمی اس کشمکش میں سانس لے سکتا نہیں
پھر بھی اس طوفان میں اے جوشؔ کی روحِ رواں
مادر و خواہر کی خدمت کو سمجھنا حرزِ جاں

اور اس کے بعد اے جانِ تمنائے پدر!
چند لمحوں کی کبھی فرصت دے تجھے دنیا اگر
باپ کی سوتی ہوئی قسمت جگانے کے لئے
قبر پر دو پھول لے آنا چڑھانے کے لئے
باغِ ہستی کے، نہ وہ باغِ جناں کے پھول ہوں
مژدۂ آزادیٔ ہندوستان کے پھول ہوں

۱۹۳۳ء

کہاں تک؟

آشفتہ سری اے دلِ ناکام کہاں تک؟
یہ شکوۂ بے مہریٔ ایام کہاں تک؟
نازائیٔ اسلاف پہ تا چند یہ ماتم؟
انجامِ تنعّم پہ یہ کہرام کہاں تک
اس دغدغۂ گردشِ افلاک سے حاصل؟
یہ وسوسۂ فتنۂ ایام کہاں تک؟

پروانہ صفت جھونک بھی دے آگ میں خود کو
آغاز میں اندیشۂ انجام کہاں تک؟

اے رہبرِ گمراہ! یہ غداریاں تاچند
او ننگِ زمانہ! ہوسِ نام کہاں تک؟

اُٹھو رعد کے آغوش میں ہے نغمۂ شیریں
یہ سازِ طرب کی ہوسِ خام کہاں تک؟

آمر صرِ سیلاب میں ہے روحِ شبستاں
یہ ذوقِ شب و ماہ و لب جام کہاں تک؟

جو دوڑ میں پیچھے تھے بہت بڑھ گئے آگے
اے پائے طلب! رشتۂ اوہام کہاں تک

گردوں پہ حریفوں نے بنا لے ہیں نشیمن
اے پست نظر! سیرِ لبِ بام کہاں تک

ہمت ہے تو مطلوب سے خود کیوں نہیں ملتا
یہ سلسلۂ نامہ و پیغام کہاں تک؟

ہاں دیکھ حریفوں کے چھلکتے ہوئے ساغر
اے تشنہ دہاں! دُردِ تہِ جام کہاں تک

کیوں قوتِ پرواز پہ ایماں نہیں لاتا؟
اے مرغِ قفس! نالۂ تہِ دام کہاں تک

خود خوشۂ انگور نچوڑا نہیں جاتا؟
اغیار سے دریوزۂ یک جام کہاں تک

ہاں خود وزیرِ رہ بھی تو ہے اسلام کا زیور
پہنے گا نقطۂ جادۂ احرام کہاں تک

۱۹۲۳ء

پیدا کر

اٹھ اور زمیں پہ نیا لالہ زار پیدا کر
نہ آئی ہو جو کبھی وہ بہار پیدا کر

عقولِ مردہ و مرطوب نوعِ انساں میں
شرار و شعلہ و دود و بخار پیدا کر

زباں کی بزم میں گفتار ہو چکی کیا حاصل
عمل کی راہ میں گرد و غبار پیدا کر

رہے نہ نسلِ جہنم، نہ آلِ خلد بریں
نئے اصول کے مردانِ کار پیدا کر

نیا نظامِ سزا و جزا مقصد رہو
نیا تخیلِ روزِ شمار پیدا کر

ضمیرِ اہلِ مناجات کے تعطل میں
خروشِ جذبۂ تکمیلِ کار پیدا کر

نظامِ کہنۂ نیلی رواق اوہام و فریب
نیا تصورِ لیل و نہار پیدا کر

غلط ہے سازِ عجم ہو کہ لحنِ اعرابی
نیا ترانہ سرِ شاخسار پیدا کر

بہت بلند ہے سطحِ مذاقِ فکرِ جدید
نظر میں اوجِ سرِ کوہسار پیدا کر

فسردگیٔ اہلِ جہاں کے حلقے میں
جواں خرامیٔ ابرِ بہار پیدا کر

کلاہِ خوجگیٔ کائنات کج کر کے
نیا زمانہ، نیا روزگار پیدا کر

الم ادھر ہے تو، یہ فسردگی تا چند
ہر ایک خار سے سو لالہ زار پیدا کر

جمی ہوئی ہے دماغوں پہ برف مدت سے
دلوں میں دولتِ برقِ شرار پیدا کر

مذاقِ بندگیٔ عصرِ نو کی تجدید کو قسم
نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

بہار میں تو زمیں سے بہار ابلتی ہے
جو مرد ہے تو خزاں میں بہار پیدا کر

سنہ ۱۹۳۵ء

غرورِ ادب

میرے جلسے سے اُٹھ آنے پر خفا ہے ہم نشیں؟
شاعروں کی فطرتِ عالی سے تو واقف نہیں

جوہرِ ذاتی کا جب افسردہ ہوتا ہو وقار
کفر سے بدتر ہے اس موقع پہ وضعِ انکسار

ناشناسانِ ادب کھوئے ہوئے ہوں جب شعور
ان مواقع پر عبادت کے برابر ہے غرور

دل ہمارا جذبۂ غیرت کو کھو سکتا نہیں
ہم کسی کے سامنے جھک جائیں ہو سکتا نہیں

راہِ خودداری سے مر کر بھی بھٹک سکتے نہیں
ٹوٹ تو سکتے ہیں ہم، لیکن لچک سکتے نہیں

حشر میں بھی خسروانہ شان سے جائیں گے ہم
اور اگر پرسش نہ ہوگی تو پلٹ آئیں گے ہم

اہلِ دنیا کیا ہے اور ان کا اثر کیا چیز ہے
ہم خدا سے ناز کرتے ہیں بشر کیا چیز ہے

سنہ ۱۹۳۶ء

مردِ انقلاب کی آواز

اگر انسان ہوں، دنیا کو حیراں کر کے چھوڑوں گا
میں ہر ناچیز ذرّے کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

تری اس زلف کی سوگند، اے لیلائے رنگینی
کہ ارضِ خار و خس کو سنبلستاں کر کے چھوڑوں گا

وہ پنہاں قوتیں جو مل کے زک دیتی ہیں دنیا کو
انہیں آپس ہی میں دست و گریباں کر کے چھوڑونگا

سرِ تقلید کو مغزِ تفکّر سے جلا دے کر
چراغِ مردہ کو مہرِ درخشاں کر کے چھوڑونگا

شعارِ تازہ کو بخشوں گا آب و رنگِ جمعیت
رسومِ کہنہ کی محفل کو ویراں کر کے چھوڑونگا!

چراغِ اجتہادِ نو بہ نو کی جلوہ ریزی سے
سرِ راہ خرد مندی چراغاں کر کے چھوڑونگا

مسلط ہیں ازل کے روز سے جو ابنِ آدم پر
میں ان اوہام کو سر در گریباں کر کے چھوڑونگا

ترے اس پیچ و خم کھانے نے دھوئیں کو شمع حق بینی
فرازِ عقل پر ابرِ خراماں کر کے چھوڑوں گا

جو انساں آج سنگ و خشت کو معبود کہتا ہے
اس انساں کو الوہیت بداماں کر کے چھوڑوں گا

قناعت جس نے کر لی ہے عناصر کی غلامی پر
میں اس کو کردگارِ بادو باراں کر کے چھوڑوں گا

قسم کھاتا ہوں اے کوہ الم! دستِ زلیخا کی
کہ داماں کو ترے یوسف کا داماں کر کے چھوڑوں گا

پکاروں گا کلیم نو کو طورِ عصرِ حاضر سے
جو کچھ کہہ دوں گا اس کو دین و ایماں کر کے چھوڑوں گا

مری حکمت، بشر کو دعوتِ نو دے کے دم لے گی
میں اس بھٹکے ہوئے انساں کو انساں کر کے چھوڑوں گا

اگر یہ کفر ہے جو کچھ زباں پر میری جاری ہے
تو میں اس کفر کو گلبانگِ عرفاں کر کے چھوڑوں گا

اگر عصیاں ہی پر موقوف ہے انسان کی بیداری!
تو میں دنیا کو غرقِ بحرِ عصیاں کر کے چھوڑوں گا

۶ ستمبر ۱۹۵۱ء

شاعرِ ہندوستاں

زندہ مُردوں کی ہے بستی، کون سنتا ہے یہاں
تھک گئے چِلّا کر دل "ہندوستاں، ہندوستاں"
اک نظر بھی قدر دانِ جوہرِ قابل نہیں
ہند کے اجڑے ہوئے سینے کے اندر دل نہیں

آئے یوسف بھی اگر بیٹھے ہوئے بازار میں
ایک گاہک بھی نہ پائے ہند کے بازار میں
سچ کہا ہے چند دیں انداز گل ہوتا نہیں
اس چمن میں بلبلوں کو عشقِ گل ہوتا نہیں

ہند ہے وہ ملک جس میں کشمکش ہے دھوکے بات
سو رہی ہے موت کے زانو پہ لیلائے حیات
وہ جماعت شرم سے نام اپنا لے سکتی نہیں
ایڈریس سی چیز جو شاعر کو دے سکتی نہیں

؎ دہلی میونسپلٹی نے ٹیگور کو ایڈریس دینے سے انکار کر دیا۔ اسی جذبہ کے تحت یہ چند شعر چند لمحوں کے اندر لکھے گئے ہیں۔

آہ اے ٹیگور، تو کیوں ہند میں پیدا ہوا؟
سچ بتا تو کس ادا سے ملک پر شیدا ہوا؟
اس جگہ تو کانپتی ہیں قہر کی پرچھائیاں
زندگی غائب ہے، مردے سانس لیتے ہیں یہاں
شعر کو، بہروں میں ممکن ہی نہیں حسن قبول
شاعرِ ہندوستاں ہے اصل میں جنگل کا پھول
جس کے گرد و پیش رہتا ہے بہائم کا ہجوم
روندتے ہیں جس کو، جو پاسے ہے، جھلستی ہے سموم
جہل کا دریا ہے اور ناقدریوں کی لہر ہے
شاعرِ ہندوستاں ہونا خدا کا قہر ہے

دردِ مشترک

سنتے ہیں طوفاں میں ڈوبا ہوا تھا اک درخت !؟
جس کی چوٹی پر ڈرے بیٹھے تھے دو آشفتہ بخت !
ایک ان میں سانپ تھا اور ایک سہما نوجوان !
دو ضدوں کا ایک بھیگی شاخ پہ تھا آشیاں
سچ ہے دردِ مشترک ہی ہے وہ روحِ اتحاد
عشق میں جس سے بدل جاتے ہیں آئینِ عناد
لیکن اے عاقل مسلمانو، مدبر ہندوؤ !
ہند کے سیلاب میں ایک شاخ پر تم بھی تو ہو

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

(جوشؔ)

رنگ و بو

دریں زمانہ نہ شد کس حریف فریادم
بہ بلبلاں چمن ہم گلے فرستادم

(حافظ رح)

نغمۂ سحر

نسیم ہوتی ہے محوِ راحت، سکوت ہوتا ہے جب چمن میں
میں پیش کرتا ہوں اپنے آنسو، خنک ستارہ نمی کفن میں
مرے گلستانِ شاعری میں، چھلکنے لگتی ہیں بزم شاخیں
نسیم، رقاصۂ گلستاں، ہنوز چلتی نہیں چمن میں
مجھے سنگھاتی ہیں روح پرور ہوائیں اسوقت بوئے قدرت
شمیمِ گلشن ہنوز ہوتی ہے بند غنچوں کے پیرہن میں
سفید ہلکی سی چاندنی میں بلند ہوتے ہیں میرے نغمے
چٹکنے والی تمام کلیاں خموش ہوتی ہیں جب چمن میں
مرا دماغ سحر پرستی ہمیشہ اس وقت جاگتا ہے
فلک پہ جس وقت چاند ہوتا ہے ملگجے خواب پیرہن میں
ہنوز نغموں کی خوابگاہوں کے اگرد ہوتے ہیں سرخ پردے
رباب دل کا میں چھیڑتا ہوں، حریمِ دوشیزۂ سخن میں

ادھر ٹپکتے ہیں اشکِ سوزاں مری جھپکتی ہوئی مژہ سے
اُدھر دہکتی ہے کچھ کچھ افشاں افق کے گیسوئے پُرشکن میں
فضا میں ہوتی نہیں ہے لرزش، خموش ہوتا ہے نطقِ عالم
یکایک اس وقت جاگتی ہے از بانِ فطرت مرے دہن میں
یہ اب تو دستور ہو گیا ہے کہ جوشؔ! کچھ رات بھیگتے ہی
سلگنے لگتی ہے سوزِ دل سے اک آگ سی میرے تن بدن سے

صبوحی

۱۹۲۳ء

اٹھ بربط و صراحی و مینا لیے ہوئے
رنگِ طلوعِ صبح ہے صہبا لیے ہوئے
ہر خار و خس ہے آئینہ دارِ عروسِ گل
ہر برگِ گل ہے عارضِ سلمیٰ لیے ہوئے

غنچے ہیں رنگِ نرگسِ خوباں سے بہرہ یاب
جھونکے ہیں بوئے کاکلِ زیبا لیے ہوئے
شبنم کا رس، نسیم کی خنکی، کلی کا رنگ،
آئے ہیں طائرانِ دل آرا لیے ہوئے

کہتے ہیں جس کو روئے صنم کی بلائیں
وہ شے ہے اپنی چھاؤں میں صحرا لیے ہوئے

رسوائیوں کا خون ہے کیفِ شبینہ کو
انگڑائیوں کا جوش ہے دریا لئے ہوئے

پھولوں کے دل ہیں شرحِ محبت سے چاک چاک
کلیوں کے لب ہیں حرفِ تمنا لئے ہوئے

شبنم ہے برگِ تازہ پہ شبنم میں سرخیاں
آبوستاں میں دیدۂ موسیٰ لئے ہوئے

اے چشمِ جوش! مژدہ، کہ لیلائے رنگ و بو
جنگل میں ہے نقاب کا گوشا لئے ہوئے

۱۹۲۶ء

ربودگی

ہو چکا ہے غروب، مہرِ منیر
ہو چلا ہے اداس ہر منظر
سامنے کا ہرا بھرا جنگل!
کھوئی جاتی ہے ظلمتوں میں نظر
بکھرنے والے ہیں پلن اب جل تھل
گونج ہے بادلوں کی، وادی میں

سامنے اب نہیں کوئی تصویر
کیوں میں بیٹھا ہوں اب پہاڑی پہ
ہو چکا ہے نگاہ سے اوجھل
بیکسی ہے گھنی کھجوروں پر
گھڑ گھڑاتے ہیں چرخ پر بادل
پڑ رہی ہیں بڑی بڑی بوندیں

بڑھتا جاتا ہے ابر و باد کا جوش   پھر بھی بیٹھا ہوا ہوں میں خاموش

اور یہ راز کبھی نہیں کھلتا!

کہ مجھے انتظار ہے کس کا؟

۱۹۲۷ء

گم شدگی

دن نے ٹھنڈی سانس لی خورشید اوجھل ہو گیا
رنگ اڑا، صحرا ہوا خاموش، دریا سو گیا!
نور سمٹا، تیرگی پھیلی، ہوائیں رک گئیں!
پھول کمھلائے، چمن سنولائے، شاخیں جھک گئیں
رنگِ گل، شورِ چمن، جوشِ صبا، کچھ بھی نہیں
ایک غم انگیز وحشت کے سوا، کچھ بھی نہیں
اڑ گیا رنگِ شفق، دل چرخ کا تھرا گیا!
رفتہ رفتہ روئے عالم پر دھواں سا چھا گیا!
اس دھوئیں میں اپنی نظریں روشنی کھوتے ہوئے
میں نے دیکھا، روحِ انسانی کو گم ہوتے ہوئے

۱۹۲۸ء

برسات کی شفق

یہ شفق ہے؟ یا فسانۂ چرخ پر عکسِ چمن
یا تصور میں کسی گل پیرہن کا بانکپن !
یا غریبِ خستہ جاں کے قلب میں یادِ وطن

یہ شفق ہے، عارضِ جاناں پہ یا موجِ شباب
خوابگاہِ خسروِ خاور کا یا زریں حجاب
روحِ انسانی کا یا بھولا ہوا جنت کا خواب

یہ سنہری دھاریاں، نیلم کے یہ نقشِ دلنگار
یہ زمرد کی چٹانیں، یہ طلائی آبشار
دیدنی ہے منتہائے صنعتِ پروردگار

آہ ان جلووں سے، دل کے زخم دیتے ہیں لہو
قلب میں انگڑائی لیتی ہے کسی کی آرزو
روح کے پردوں میں جل اٹھتی ہے شمعِ آرزو

ان مناظر میں ابلتی ہے ندی جذبات کی
تیز ہو جاتی ہے دل میں، آنچ محسوسات کی
خون کے آنسو رلاتی ہے شفق برسات کی

مل رہا ہے سرخیوں میں ایک ہلکا سا دھواں
جھک رہا ہے رفتہ رفتہ آفتاب زرفشاں
پستیوں میں سر بہ سجدہ ہے غزدلہ آسماں
یاد آتی ہے کسی کی کم نگاہی کیا کروں
چھائی جاتی ہے ہر اک شے پر سیاہی کیا کروں
یہ مناظر کھائے جاتے ہیں، الٰہی کیا کروں

۱۹۲۴ء

آدھی رات
اور
ربودگی کا ایک لمحہ

رات آدھی آ چکی ہے، خلق ہے مصروفِ خواب
نصفِ شب کے فاصلے پر جا چکا ہے ماہتاب
جھک چکا ہے پاسئے خاموشی پہ گھوگرجی کا زور
گرسنہ شیردل کی صورت، ہونکتی سڑکوں کا شور
اب نہیں ان کارخانوں کی کلاہِ فخر کج ہے!
جن میں تھی بپھرے ہوئے بادل کی طوفانی گرج
ہو چکا ہے خاموشی کی بزم میں خواب و خیال
گرمِ کل پرزوں کی پیہم گھڑگھڑاہٹ کا جلال
رہ چکی ہے لیلیٰ امن و اماں بالائے طاق
اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ، توتوں کا طمطراق

شاہراہوں پر نظر آتا نہیں نزدیک و دور
مرکبِ شاہی کا کرّ و فر، حکومت کا غرور
دفن ہے تکیوں میں اہلِ کبر کا ہر اک بناؤ!
گردنوں کا خم، لبوں کی مہر، چہروں کا کھنچاؤ!

زر کے پیچھے دن کو پھرتے تھے جو گھبرائے ہوئے
سو رہے ہیں بستروں پر، ٹھوکریں کھائے ہوئے
کہہ رہے ہیں کتنی الجھی حسرتوں کی داستاں
راستوں پر گاڑیوں کے پیچ و خم کھاتے نشاں

دن کو برپا تھی جو ہلچل کوچہ و بازار میں
ہو چکی ہے جذب، گلیوں کے در و دیوار میں
زیست کے ماتھے پہ ہے پسپائیِ شب کا سرد ہات
سرنگوں ہے دبدبہ انگیز طوفانِ حیات

لڑنے والے سرد ہیں، سنسان ہے میدان جنگ
اڑ چکا ہے فکر کی ماری ہوئی دنیا کا رنگ!
گھٹ چلا ہے مضمحل گیتی کے دل کا ارتعاش
مٹ چلی ہے نیم جاں راہوں کے سینوں کی خراش

چاندنی سے پا چکا ہے اک بڑی حد تک سکون
دھوپ سے کھولا ہوا خاشاک کی نبضوں کا خون
پھر بھی اب تک کرب سے ذرات کے چہرے ہیں زرد
لے رہی ہے سسکیاں روندی ہوئی سڑکوں کی گرد

ضو فگن ہے چاند عالم پر بصد لطف و نیاز
جس طرح بیمار کی بالینِ غم پر چارہ ساز!
سو رہے ہیں برق پا جھونکے ہوائے سرد کے
مفلسی کی تلخ فریاد دل کو دامن میں لیے
صبح کے فاقے سہہ چکے ہیں بندگانِ سوگوار
رزق کے وعدے کو ایفا کر چکا ہے کردگار
بن چکی ہے سینۂ رحمت میں اک ہلکی سی آہ
منعموں کی چینِ پیشانی، غریبوں کی نگاہ
ہو چکی ہے سست، گرم انفاس سے بوجھل ہوا
وقت کا پہیا نظر آتا ہے کچھ رکتا ہوا
سرنگوں ہے خاک پر سعی و عمل کی بارگاہ
خفتہ ہے عالم، مگر بیدار ہے عشق و گناہ
لیکے انگڑائی اٹھی ہیں خواب سے خونخواریاں
جرم کے سینے میں ہیں شب خوں کی تیاریاں
شحنۂ سلطاں کے دل میں گرم ہے ذوقِ سراغ!!
جل رہے ہیں دھندلے دھندلے طاقِ ساز میں چراغ
پھر رہی ہے موت کا گویا مزا چکھتی ہوئی!
شبِ سردی، دہشت کے سینے پر قدم رکھتی ہوئی
شب کی تاریکی سے ہیں اچھے برے سب بہرہ مند
شانۂ عاشق پہ کاکل، دوشِ سارق پہ کمند

اک طرف ہیں گرمِ شیون عاشقانِ نامراد
چاندنی میں ڈس رہی ہے اور بھی جانان کی یاد
ہجر کی ماری جوانی کو سلانے کے لیئے
کروٹوں پر کروٹیں ہیں نیند آنے کیلیئے

کروٹوں میں بجھ رہی ہے بے مزا لمحوں کی دھار
جنبشِ مژگاں سے دامن رات کا ہے تار تار

خوش نصیبوں کو ادھر ہے، دعوتِ کام و دہن
زینتِ آغوش ہیں، آتشیں بدن غذار و سیم تن
میکدوں کی مسندوں پر، مطربوں کی بزم میں
ہیں گلوں نقرئی باہوں کی ہلکی ہیکلیں
خلوتوں میں رنگینی کی طرح ہے گونجی ہوئی
اک ملائم سی سراہٹ، ریشمی ملبوس کی
لعلِ عطر افشاں پہ رقصاں ہے تبسم کی پھبن
ماہ نو کے سامنے جس طرح برگِ یاسمن
گوشے گوشے میں ہے بزمِ ناز کی ہنستی ہوئی
گنگنوں کی جگمگاہٹ، ساعدوں کی چاندنی
تیز تیز انفاس کی خوشبو، گلے کے ہار ہیں
خلوتیں ڈوبی ہوئی، رنگِ لب و رخسار ہیں

اک طرف ساقی کی آنکھیں، اک طرف جامِ شراب
کھیل میں مصروف ہے، اربابِ عشرت کا شباب!

اور میں ہوں اس طرف زلفِ تخیل کا اسیر
ذہن یوں منور ہے جس طرح صانع کا ضمیر
چھو رہی ہے میری پیشانی کو ان جذبوں کی سانس
جن کی ہر کروٹ دلِ شاعر میں دنیا تی ہے پھانس

عود کر آیا ہے گویا اولیں دورِ شباب
گردشیں گزری ہوئی راتوں کے صد ہا آفتاب

دل پہ ہے اس پُر نشاں لمحے کی از خود رفتگی
اک کڑی ہوتا ہے جو مابینِ مرگ و زندگی!

جس کے سناٹے میں کھو جاتا ہے غوغائے حیات
راگنی میں جو بدل دیتا ہے شورِ کائنات!

خار سے دامن نہیں جس کا الجھتا راہ میں
اور جو مستقبل و ماضی کی ہے طوفاں گاہ میں!

حال کے اس لمحۂ نازک پہ کرتا ہے نظر
نوکِ مژگاں سے ہوا کرتا ہے جو باریک تر

اور پھر اس لمحۂ مبہم سے بے حدّ و قیاس
کھینچ لیتا ہے حیاتِ جاودانی کی مٹھاس

اور اڑ جاتا ہے پھر بے خود بنا چکنے کے بعد
وقفۂ حاضر کو تاجِ زر پنہا چکنے کے بعد

۱۹۲۶ء

برسات کی پہلی گھٹا

کیا جوانی ہے فضا میں، مرحبا صد مرحبا
چل رہی ہے روح کو چھوتی ہوئی ٹھنڈی ہوا
آ رہی ہے دور سے کافر پپیہے کی صدا
حسن اٹھا ہے خاک سے انگڑائیاں لیتا ہوا
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

آج ذروں میں ہے تلاطم، جوش ارمانوں میں ہے
حسرتوں میں ولولے ہیں، تازگی جانوں میں ہے
نوجوانی کا تبسم سرد میدانوں میں ہے
روشنی ہے دشت میں، خوشبو بیابانوں میں ہے
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

مطربوں نے ساحلوں پر جا کے چھیڑے ہیں ستار
ہل دھرے کاندھوں پہ ہنستے جا رہے ہیں کاشتکار
مست ہے جنگل میں چرواہا، چمن میں جوئے بار
گا رہا ہے ناخدا دریا کے سینے پہ ملار
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

بستیوں میں لَے سے گرم زمزمہ، جنگل میں باس
جی اُٹھی ہے دھوپ کے مارے ہوئے میدان کی [illegible]

[illegible] رہے ہیں پھول جیبوں سے [illegible]
ابر کے ناخن نے دل سے کھینچ لی [illegible] پھانس

جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

ماہ پیکر لڑکیاں رنگینیوں پہ تُل گئیں
رنگ کی پڑیاں ہزاروں ایک دم میں کھل گئیں
دل جو گھبرائے سے تھے [illegible] سب دُھل گئیں
گرد جو [illegible] اس طرح سے بیٹھی [illegible] دُھل گیا

جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

بستر سبزہ پہ بادل نے جہاں مخمل [illegible] ندیاں [illegible]
جھوم کر [illegible]
آج [illegible] صفحہ [illegible] زمیں
سر [illegible] گود [illegible] بدلیں

جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

چھا گئی لو، دفعتہ آموں کے باغوں پر بہار
اُٹھ رہی ہے سوندھی سوندھی سی شمیم خوشگوار
شاخِ گل پر کوئل غزلخواں ہے لبِ جو [illegible]
گا رہے ہیں [illegible] ڈالی نیم کے نیچے کہار

جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

بہہ رہا ہے تیز پانی، بہک رہی ہیں بوتلیاں
رقص کرتا جا رہا ہے موجِ باراں میں دھواں
مہوشوں کی زیب و زینت، اجھید و امال
ہر کلائی میں نظر آتی ہیں دھانی چوڑیاں!
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

ابر کے سیلاب میں ڈوبا ہوا ہے جزو و کل!
ہاں ۔۔۔ غنچوں میں بھی ڈوبا ہوا ہے خونِ گل
صحن میں پانی ہے اور پانی میں بچوں کا غسل!
اک طرف لکڑی کی کشتی، اک طرف مٹی کی نائیں!
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

باغ کی روشیں تھم خواریاں سی بن گئیں!
سبزہ زاروں کی گلستانیں زردار یا سی بن گئیں!
بھر گیا پانی زمیں پر دھاریاں سی بن گئیں
جا بجا مٹی جو سمٹی کیاریاں سی بن گئیں!
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

زندگی کی سرد نبضوں میں حرارت آ گئی!
منھموں میں خلق کی ۔۔۔ ہڑاں میں نزاکت آ گئی
بجھ گئے افسردہ چہروں پر بشاشت آ گئی
بندے خوش چشموں کی آنکھوں میں مروت آ گئی
۱۹۳۲ جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا!

مغموم درخت

سڑک، غلغلہ، ہلچل، غبار — دو رویہ درختوں کی سیدھی قطار
کوئی ہے بازو یا حزن و گداز تر! — سُنے ان درختوں کی کلبوں نے سار

اسی طرح اس مادّی عہد میں
کہاں دلِ گرِ شاعر کے نغمے سُنیں

سنہ ۱۹۴۷ء

پیغمبرِ فطرت

تاروں نے جھلملا کے چھیڑا ستارِ صبح
گانے لگی چمن میں نسیم بہارِ صبح،
غنچوں میں چشمِ ناز سے ٹپکا خمارِ صبح
ابھرا افق سے جامِ زمرد نگارِ صبح
شاعر کی روح، عشق کی ہمراز ہو گئی
دنیا تمام جلوہ گہِ ناز ہو گئی

شمعیں ہوئیں خموش، جھپکنے لگے تیور
اُلٹی نقاب چرخ نے، جھلکا زمیں پہ نُور!
سینوں میں اہلِ دل کے ہوئے قلب چُور چُور
آنکھوں سے رُخ پہ دوڑ گیا آنسوؤں کا نُور
دریا پہ چٹک گئیں کلیاں گلاب کی!
پھوٹی کچھ اس ادا سے کرن آفتاب کی
سبزے پہ ہر آئی، جنوں خیز ہو گیا
جھونکا ہر اک نسیم کا گل ریز ہو گیا
شب کا سکوت لحنِ دِلآویز ہو گیا!
رنگِ حیات ولولہ انگیز ہو گیا!
تنویر خندہ زن ہوئی تاریک رات پر
حسنِ ازل کی چھوٹ پڑی کائنات پر
بادِ سحر کے جام پہ قربان ہزار جم!
دامن تمام شبنمِ تازہ سے ہے بہ نم!
جھونکے نسیم کے یہ چمن سے ہیں بارِ کرم
ہر سانس غسل دیتی ہے سینے کو دم بدم
تھا لہر لہر جو شب کی کثافت، وہ دھل گئی
گہری جو سانس لی، تو گرہ دل کی کھل گئی
وارفتگی کی سینۂ مشرق میں ہے امنگ
ہر چیز میں حیات کی پیدا ہے اک ترنگ

گردوں کی آب و تاب سے ہوتی ہے عقل دنگ
ہلکا سا ابر، ابر میں ہے چمپئی سا رنگ!
جامِ زمرّدیں ہیں موجیں شراب کی!
شبنم میں چھد رہی ہے کرن آفتاب کی
دُھو دُھلائے ہوئے ہیں شگوفے بوستاں
کندن بنی ہوئی ہے پہاڑوں کی چوٹیاں!
تاروں کا بزمِ چرخ پہ باقی نہیں نشاں
آنکھیں ہیں بند، ساکت و صامت ہے آسماں
ہاتھوں پہ آفتابِ درخشاں لئے ہوئے
حسنِ ازل کا دل میں تصور کئے ہوئے
رقصاں ہے بحرِ انجمن، آفتاب میں!
جس طرح روحِ شکر ہو موجِ شراب میں
ہر سبزہ ہے پا بہ زلفِ دوتا پیچ و تاب میں
غلطاں ہے روح، بادِ صبا کی حباب میں!
سوتیں رواں ہوئی ہیں کچھ اس سوز و ساز
جس طرح کوئی چونک پڑے خوابِ ناز سے
شمعیں بجھاتی آئی ہیں ٹھنڈی ہوا کی رو
پروانے سرنگوں ہیں دھواں دے رہی ہے لَو
یہ وادیوں میں پھیل رہی ہے سحر کی ضو
یا آرہی ہے سر کو جھکائے عروسِ نو

آنکھوں میں دل فریب تبسم لیے ہوئے
کاکُل سے چشمِ سُرخ پہ سایہ کیے ہوئے
اے جوش اِدھر دیکھ غور سے، یہ رقصِ رنگ و بُو
کب سے ہے تجھ کو پرتوِ جاناں کی آرزو
ہاں دیکھ! یہ تبسمِ گُلِ ناز آب جُو!
تُو تو کی یہ صدائے دلِ افسردہ کو کُو!

آنکھیں اٹھا، علاجِ دلِ دردمند کر
پیہم صدائیں صلِّ علیٰ کی بلند کر!
یہ صحنِ گلستاں میں ہری دوب کی ادا
یہ وادیوں کی اوس میں ڈوبی ہوئی ہوا
یہ کوئلوں کی کوک، پپیہے کی یہ صدا
رخسارِ گُل پہ رنگ، یہ ہلکا سا غازہ سا
رنگینیاں یہ سلسلۂ کوہسار کی!
یہ رنگ گھاٹیوں میں صدا آبشار کی
یہ آب و تاب چادرِ آبِ رواں، یہ نُور
نزہت کا یہ ہجوم، لطافت کا یہ وفُور
یہ دامنِ نسیم میں اسرار ہائے سحر دُور
بکھرے ہوئے زمیں پہ موتی یہ دُور دُور
یہ جھلکیاں سی پردۂ ظلمت میں نور کی
معرفت میں غرق، صدائیں طنبور کی

مجھ کہہ کے بزمِ صبح ہے یہ الوداعِ رخِ ماہ
یہ صبح کی نسیمِ خنک، یہ ہری ہری گیاہ
یہ نہر کی تڑپ، یہ چادر تھرتھری نہیں سنسان !
یہ نکھریاں ہما تازہ کہ اللہ کی پناہ !
صحنِ زمیں پہ شب کی سیاہی چھائے ہوئے
یہ آسمان، افسردہ شانی لیے ہوئے
گنبد یہ تھے یہ کلس، یہ دلدادہ یہ کوہسار
یہ دل کشا چمن، یہ فرحت بخش لالہ زار
ثنا خواں کا دل لبوں سے چھلکتا ہے بار بار
یہ مہر کا جمال، نہ پنہاں، نہ آشکار
یہ آسمان جلوہ گہ پر تلا ہوا !
یہ حسنِ لازوال کا پرچم کھلا ہوا !
اے شیخ ! تو نہیں ہے نفی نفی سے بہرہ یاب
فطرت پرست جوش ہے اور اس قدر خراب
فطرت بھی تیری طرح ہے مست شراب
اس کا دیدار کا صحیفہ تو رہا ہے آفتاب
ناشناس کہہ رہا ہے جب تو وہ پھول کا
ذرا الہ بابِ غنچہ نشاط بھی سوالیہ

۱۹۲۶ء

شام کی بزم آرائیاں

چھپ گیا جب سے [illegible] چھانے لگیں
بدلیاں جھنگلی جیسے اک وحشت سی چھانے لگیں
جگنوؤں کی انگلیاں [illegible] بیٹھ آن پہنچیں
ظلمت شب کی [illegible] جال پھیلانے لگیں

پھول [illegible]
[illegible] چھانے لگی
تیرگی پھیلی [illegible]
وحشتیں بکھرا کے [illegible] غصے [illegible]

[illegible] آسماں پر چھا گیا
[illegible] لہرانے لگی

طائر [illegible] تمام
[illegible] ہو آئیں [illegible]

رک گئے دریا روح سے سر [illegible] نکلا
نغمے کے موجیں چرخ کو [illegible] دکھانے لگیں

پھر گھنے جنگل میں چھیڑا غم کی دیوی نے ستار
پھر خنک تاروں کی آنکھیں اشک برسانے لگیں

پھر خموشی کی حدیثِ غم نے بسمل کر دیا!
پھر شفق کی داستانیں خون رُلوانے لگیں

جتنی چوٹیں دل پہ کھائی تھیں، ابھر آئیں تمام
جتنی شکلیں دل میں پنہاں تھیں نظر آنے لگیں!

پھر کسی خوشبو کا پرتو روح میں غلطاں ہوا
پھر کسی محفل کی شمعیں دل میں تھرانے لگیں!

پھر تخیل کو اندھیرے نے سجھایا راستہ!!
پھر تصور میں گھٹائیں برق چمکانے لگیں!

تیرگی نے پھر منور کر دیا قصرِ دماغ
ظلمتیں پھر ہر قدم پر نور دوڑانے لگیں

میٹھا میٹھا درد پھر سینے میں پیدا ہو گیا
صحبتیں بچھڑی ہوئی پھر ہائے یاد آنے لگیں!

ناگہاں تاریک جنگل میں یہ بزم آرائیاں!
جوش! اب گھر چل، کہ گہری بدلیاں چھانے لگیں

۱۹۲۷ء

حسرت

خورشید جہاں تاب جب آنکھوں سے ہو اجھل
آوارہ نظر آتے ہوں جب چرخ پہ بادل!

سینے میں خیالات ہوں جب لا متناہی
چھائی ہو تر و خشک پہ ہلکی سی سیاہی

جب چرخ پہ دو چار ستارے نظر آئیں
پرنوں کے جب نہر پہ طائر اُتر آئیں

جب خوب شفق گرم ہو اور سرد ہو صحرا
بہتا ہو جب آہستہ مچلتا ہوا دریا!

جب چرخ پہ فانوس، مہِ نو کا ہو روشن
جیسے کسی نوعمر کا ٹوٹا ہوا کنگن

ہمراہ مرے جب کوئی ہمدم ہو نہ ہمراز
کچھ دور سے جب بانسری کی آتی ہو آواز

کھنچ آئیں جب اس نقطۂ اسرار پہ جذبات
پیدا ہو خوشی سے الم انگیز خیالات

جب بادۂ دردِ جگر اتنی لطافت سے ہو پیدا
دِل کو خلشِ غم پہ بشاشت کا ہو دھوکا!

ہو دل میں سمویا ہوا احساس کا جوہر
آنکھوں میں ہوں اشک اور تبسم ہو لبوں پر
جب شورشیں ادراک کی، خاموش ہو دل میں
جب شادی و غم دونوں ہم آغوش ہوں دل میں
جب موجِ ہوا میں نفسِ شام کی بُو ہو
حسرت ہے کہ اُس وقت مرے سامنے تُو ہو
۱۹۲۹ء

بھری برسات کی رُوح

تیرگی پُر ہول صحرائے اماں، بادل سیاہ!
ایک میں ادھر یہ اندھیری رات کی خونی سپاہ
گھاٹیاں تاریک راہیں گم، ہوائیں ناصبور
رُوح فرسا طاقتوں کی حکمرانی دُور دُور
ابر پیچ و تاب میں ہیجان میں آبِ رواں
آسماں بپھرا ہوا، بھیگی زمیں کف در دہاں
جھینگروں کی تان، بادل کی گرج پانی کا شور
مینڈکوں کے راگ، بجلی کی کڑک، نالوں کا زور

کون ہے اُلجھی ہوئی شاخوں کے اندر بیقرار؟
کون مجھ کو گھورتا ہے جھاڑیوں سے بار بار؟
بجلیاں سی کُنج میں رہ رہ کے چمکاتا ہے کون؟
روئے ظلمت کو بالتفصیل دکھلاتا ہے کون؟
کون یہ آواز دیتا ہے۔ کہ آتا کیوں نہیں؟!
جو شعاع ان ظلمت کے پردوں کو اُٹھاتا کیوں نہیں؟
ہاں، لیا، اٹھا وہ کوندا سا دلِ سرشار پر!
اب میں سمجھا کون ہے ان پردہ ہائے تار میں
مجھ سے ملنے آئی ہے رنگینیاں اندھیری رات کی
[illegible] بکھری ہوئی برسات کی

۱۹۳[illegible]ء

پیاسن ناگن کالی رات

ایک دکھیا، حزیں، پریشاں حال — پی کی دوری سے جس کا جی ہے نڈھال
روتی رہتی ہے ساری ساری رات — اک قیامت ہے جان پر برسات
سر اٹھا کر وہ جب نظر اٹھاتی ہے — دردِ دل اس طرح سناتی ہے
دیکھنے کو نہیں مری جاں تک — زرد ہوں "اے مناظرِ قدرت!

بادلوں سے ہلال کو ڈھانک دیا
اے تر و تازہ سحر نو! جاگی!
جلدی اس دیس سے گزر جاؤ!
ورنہ مہکیں گے پھول گلشن میں
یوں نہ پاپی پپیہے تان لگا
دیکھ پڑ جائے گی! دل نہ کھلائے
زلف عاشق سنوارنے والی!!
پی کی نگری میں جا کے پھر جل تھل۔
ہائے جیون تو بس اختلاج ہے یہ
سوچتا تھا نہیں ہے بات کو بات
کھائے جاتی ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
کیا ہوا تجھ کو ہائے جی کے لرز
سونگھ سکتی تھی تو زلف کی خوشبو
یوں ہی چھاتی جو دھڑکتی جائے گی
نگر اکیلا ہے پڑ رہا ہے بچھونا
اے سہیلی! بچا مجھے انسانی!

اپنا خنجر نیام میں رکھ لو!
اسے کالی گھٹاؤ! ساون کی
دار ہی اک بوند بھی نہ ٹپکاؤ!
آگ لگ جائے گی مرے تن میں!
جس نگر میں پیا ہیں، وہیں اٹھ جا!
لوگ جھوٹ کا ادھر نہ آنے پائے!
نوچ لے چوٹیں ابھارنے والی!
میرے سر پر گرج نہ او بادل!
پی ہیں پردیس میں پرائے رہے
ڈس رہی ہے نگوڑی کالی رات!
دل میں کھٹکتی ہے بوندیوں کی صدا
مور جنگل میں کر رہے ہیں شور!
آنکھ میں بھر رہی ہے نیند کا آنسو
ہائے کس طرح نیند آئے گی!
کیسا سوز رکھتے اے سکھی پشیمان
یہ تو مجھ کو بتا تیرے غریب تن!

سیج سونی ہے اور برستی رات
باؤلی ہو گئی ہے دیا برسات

۱۹۳۴ء

بہار کی ایک دوپہر

بے چین ہیں ہوائیں بادل ہے ہلکا ہلکا
بھیڑیں چرا رہی ہیں دوشیزگانِ صحرا
کچھ لڑکیاں چنے کے کھیتوں میں گا رہی ہیں
کچھ پھول چن رہی ہیں، کچھ ساگ کھا رہی ہیں
بوڑھا کسان اپنی گاڑی پہ جا رہا ہے
کھیتوں کو دیکھتا ہے اور سر ہلا رہا ہے
زیرِ قدم جو برگ پژمردہ آ رہے ہیں!
ہر گام پہ کچل کر نغمے سنا رہے ہیں!
خورشید بادلوں میں کشتی بنے رہا ہے
کوّوں کا بدنما رنگ اک لطف دے رہا ہے
کھیتوں پہ دھندلی دھندلی قدرت کی چمک رہی ہیں
[illegible] ملتی ہیں

سورج ہے سر پہ، بادل سایہ کئے ہوئے ہیں
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے گرمی لئے ہوئے ہیں
غنچے چٹک رہے ہیں گلزارِ زندگی کے!
در کھل رہے ہیں دل پر اسرارِ زندگی کے!
خود اپنے حافظے میں جلوے دکھا رہا ہوں
کھویا گیا ہوں ایسا، اپنے کو پا رہا ہوں

سنہ ۱۹۲۳ء

شبِ ماہ

الاماں! کیا چاندنی چٹکی ہوئی ہے دور تک!
ذرے ہیں خاک پر چاندنی کے لاکھوں آئینے
بہہ رہی ہے قلبِ سوزاں سے یہ ٹھنڈی چاندنی
جوش میں آتی نہ کب تک رحمتِ پروردگار
یہ شگوفوں کا تبسم، یہ ستاروں کا جمال!
موجِ رنگینی سے یہ ہلکورے یہ دریا کا نکھار

اجلی اجلی چوٹیوں پر یہ روپہلی چاندنی
یہ ہوا کی نغمہ ریزی، یہ سکوتِ کوہسار
جا بجا یہ ابر کے ٹکڑوں میں تاروں کی جھمک
دُور تک یہ جھاڑیوں میں جگنوؤں کا انتشار

یہ سنکتے سرد جھونکے کارواں در کارواں!
یہ ہمکتی جھلملی موجیں قطار اندر قطار!
یہ بساطِ نہر پر چاندنی کی نازک دھاریاں
یہ جبینِ آب پر الماس کے نقش و نگار

چادرِ آبِ رواں پر، یہ ضیائے مرتعش
صفحۂ موجِ خنک پر یہ نقوشِ بے قرار
تیرتا پھرتا ہے یہ بادل کے ٹکڑوں میں ہلال
یا نظر آتا سفینہ درمیانِ جوئے بار!

یہ کلی پہ قطرۂ شبنم میں ہے نورِ قمر
آنکھ کی پتلی میں یا خط و خالِ عکسِ روئے یار
یہ گھنی شاخوں سے چھن کر آ رہی ہے چاندنی
قلبِ شب میں، یا تصورِ صبح کا ہے بے قرار

بات قدرت میں نہیں اشعار یہ وردِ زباں
یہ جھلکیاں قدرت کے تحفے ہیں اے پروردگار
ہاں مگر ہاتھوں کے فن کا ہے یہ احساسِ شکستہ
شانِ قدرت پہ طبع سے زباں ہے تار تار

آہ اے فطرت! تری رعنائیوں کے سامنے
بہتریں الفاظ ہو جاتے ہیں میرے شرمسار
حُسن تیرا، ذوقِ گویائی کو ہی دیتا ہے لب
راگنی تیری، زباں کا توڑ دیتی ہے ستار!

تیری محرابِ تجلی میں، وفورِ شرم سے
سر جھکاتا ہے مرے زورِ بیاں کا افتخار
تیرا دریا نطق کی وادی میں بہہ سکتا نہیں
آدمی محسوس کر سکتا ہے، کہہ سکتا نہیں!

۱۹۲۲ء

مُبہم پیام

(شعلۂ شبنم)

قلبِ صحرا میں جھٹپٹے کے وقت!
دل میں غلطاں ہے ایک طرفہ اضطراب
مجھ سے کہتا ہے، کیا، خدا جانے؟
دہقاں کے کھیت پر شفق کا رنگ

مُنہ اندھیرے

مُنہ اندھیرے میں اٹھا ہوں شعر کہنے کے لئے
تیرگی میں نور کے دریا میں بہنے کے لئے
سُرخیِ افق، نازِ صبا، بانگِ ہزار
واہ کیا سامان ہیں بشاش رہنے کے لئے
مسکراتی آرہی ہے صبح کی مشعل لئے!
لو یہ فطرت، مجھ سے اپنے راز کہنے کے لئے
وہ کلی چٹکی، وہ بدلا سایہ رنگ، وہ پھوٹی کرن
جلس کے وہ انگڑائی لی دریا نے بہنے کیلئے

۱۹۳۲ء

روحِ شام

مغرب کی وادیوں میں خورشید اتر رہا ہے
تصویرِ بے خودی کا ہر نقش ابھر رہا ہے

پامال و خشک پتے بکھرے ہوئے پڑے ہیں
سرسوں کے کھیت سارے جھکے ہوئے کھڑے ہیں

چرواہے جھٹپٹے کی تانیں سنا رہے ہیں
چوپائے سر جھکائے گھر ان سے جا رہے ہیں

روحیں لرز رہی ہیں فرقت کے گل جلوؤں کی
ظلمت میں بج رہی ہیں یا گھنٹیاں بلور کی

گلے گزر چکے ہیں سبزہ پڑا ہے وندرا!
کیا کیا مہک رہا ہے پھولا ہوا اگر وندرا!

اک سمت چھوٹی چھوٹی رنگیں پہاڑیاں ہیں
اک سمت قطاراں ڈھاکے کی جھاڑیاں ہیں

کیا دلکشی بیاں ہو، گھنگھور تک جھاڑیوں کی
نقشی ہوئی ہیں راہیں جن میں سے گاڑیوں کی

اِن جھاڑیوں لگا مد ر میری نظر بڑی ہے
دوشیزہ اک، کمر تک ڈوبی ہوئی کھڑی ہے

سرشار جھاڑیوں کے نغمے شُمار ہی ہے
محرابِ رنگ و بُو میں شمعیں جلا رہی ہے

ٹیکا نہیں جبیں پر نیلم جڑا ہوا ہے
اک ہار رسا گلے میں تر چھا پڑا ہوا ہے!

رُخ پر اثر شفق کے آغوشِ تربیت کا
زُلفِ سیہ پہ جنبیاں پرچمِ الوہیت کا

آنچل پڑا ہوا ہے زُلفِ سیہ پہ دھانی!
غمگیں سروں میں گُم ہے اٹھتی ہوئی جوانی

اے جوشؔ! ادب سے جھک جا تو جانتا نہیں ہے!
وہ بار یہ ہے کس کے؟ پہچانتا نہیں ہے

اس بھیس میں جو مست و بیخود بنا رہی ہے
یہ رُوحِ شام تجھ کو جلوے دکھا رہی ہے!

.:::::::::::.

بہار آنے لگی

پھر بہار آئی، ہوا سے بوئے یار آنے لگی!
پھر پپیہے کی صدا دیوانہ وار آنے لگی!

پھر یہاں کا شور اٹھا، چھڑا سبزہ کا غلغلہ!
کونپلیں کوکیں، صدائے آبشار آنے لگی!

کھیت جھومے، ابر مچلا، پھول مہکے، دل کھلے
کونپلیں پھوٹیں، ہوائے مشکبار آنے لگی!

قمریاں چہکیں، ہلے پودے، چلی ٹھنڈی ہوا
جام کھنکے، روئے مینا پر بہار آنے لگی!

پھر نسیمِ دلربا چلنے لگی مستانہ وار!
پھر شمیمِ طرۂ گیسوئے یار آنے لگی!

پھر سماعت سے نوائے کیف نے کی چھیڑ پیار
سامنے پھر لیلئ نقش و نگار آنے لگی!

پھر شگوفے مسکرائے، پھر چھپیں سینے میں جوش
جوش! یادِ یار پھر بے اختیار آنے لگی!

۱۹۳۴ء

سیرِ گردوں

آج رُوئے دلنشیں ہے، اور شام کا سماں ہے!
"پنجاب میل" سینہ نے ہوئے رواں ہے!
اُٹھ اُٹھ کے سبزیوں کے پردے سے گھر رہے ہیں
بادل کے چند ٹکڑے آوارہ پھر رہے ہیں! !
آوارہ پھر رہے ہیں یوں بے رفیق و ناصر
جس طرح جھنڈ کے بھٹکے ہوئے مسافر
رنگینیوں کا دریا طوفاں اٹھا رہا ہے
اِک رنگ آرہا ہے، اِک رنگ جا رہا ہے!
اُف! دامنِ شفق کا اندازِ دِلستانی!!
کلیاں تو ہیں گلابی اور گوٹ آسمانی!!
تا دُور اِک سنہرا دریا بھرا ہوا ہے!
خونِ سخن رگوں میں لہریں سی لے رہا ہے!
جی چاہتا ہے، ہوتی ہیرے کی ایک کشتی!
کشتی پہ ساتھ ہوتا اک مستِ ناز ساقی!

جو شفق کے اندر، کشتی کو ڈال دیتا
ارض و سماں کو اپنے دل سے نکال دیتا
مجھ سے قریب ہوتا گردوں کا بام رنگیں
ساقی کی بانسری پر سنتا کلام رنگیں!
صحت کا مبیری ساغر۔ اس لالہ فام پینا
پھر دوں خم شفق سے بھر بھر کے جام پیتا
تصویر آرزو میں رنگ نشاط بھرتا
اس وقت تک برابر گردوں کی سیر کرتا
جب فرط دلبری سے، ہلکی سی تیرگی میں
منہ دیکھتے ہیں تارے شبنم کی آرسی میں

۱۹۲۳ء

نیچر کی خوابگاہ

رحم کر! للہ اے انجن کی سیٹی! رحم کر!!
شام کا وقت ہے، ویرانے کا سناٹا نہ چھین!
ذرہ ذرہ ہے یہاں، روندا ہوا تپتا ہوا!
دو گھڑی نیچر کو سو رہنے دے اے اللہ کی مشین

۱۹۲۹ء

البیلی صبح

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے!
سحر کا تارا ہے زلزلے میں، افق کی لو تھرتھرا رہی ہے!
روش روش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشنِ رنگ و بو ہے!
طیور شاخوں پہ ہیں غزلخواں، کلی کلی گنگنا رہی ہے!
ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے!
نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے!!
طیور بزمِ سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں!
نسیمِ فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے!
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے، پڑا ہے شبنم کا ایک موتی!
نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے، کوئی پری مسکرا رہی ہے!
سحر کو مدِ نظر ہیں کتنی رعائتیں چشمِ خوں فشاں کی!
ہوا بیاباں سے آنے والی، لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے
شلوکا پہنے ہوئے گلابی۔ ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں!
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا، ہوا میں پلو سکھا رہی ہے!

فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں، ہلال کے گرد دو چمکتے تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی، جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے
کھٹک یہ کیوں دِل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں، یہ کس کی آواز آ رہی ہے

۱۹۲۵ء

لُو کی آمد آمد

طے صبح کی راہ کر چکی ہے!
دیواروں سے دھوپ اتر چکی ہے

خنکی کی الٹ پلٹ ہے مسند
میداں میں ہے لُو کی آمد آمد

آتی ہیں ہوائیں سنسناتی
پودوں کی دھڑک رہی ہے چھاتی

دوزخ میں بہشت ہے غزلخواں
شاخوں پہ چہک رہی ہیں چڑیاں

چوپائے ابھی سے ہانپتے ہیں!
ہیبت سے درخت کانپتے ہیں!

ہر سُو ہیں رواں دواں بلائیں
لرزاں ہیں طیور کی صدائیں

تھم تھم کے نکل رہے ہیں شعلے
انبار سے خشک پتیوں کے!

تیزی سے ہوائیں آ رہی ہیں
سُن سُن کی صدائیں آ رہی ہیں!

یوں گرد و غبار چھا رہا ہے!
میداں کے حواس اڑا رہا ہے

ہلکی سی فلک پہ کچھ گھٹا ہے!
خورشید ذرا سا چھپ گیا ہے

میداں بدل رہا ہے کیا روپ!
سایہ تھا ابھی، ابھی کڑی دھوپ
پُرہول ہوا سے ارغنوں ہیں!
آموں کے درخت سرنگوں ہیں
گھبرائے ہوئے ہیں باغ والے
ہو جائیں کہیں نہ خشک تھالے
پھرتے ہیں اِدھر اُدھر کھلے سر
کاندھوں پہ کُدالے، نظر فلک پر
سوکھی ہوئی گھاس ہے فسردہ
افسردہ نہیں ہے، بلکہ مُردہ
دوزخ کی نظر ہے بزمِ جاں پر
وحشت ہے زمین و آسماں پر
پہلو سے زمیں بدل رہی ہے!
ذرّوں سے دھنک نکل رہی ہے
گرمی کی ہے باڑھ پر جوانی
ہر ذرّہ پکارتا ہے پانی"

سنہ ۱۹۳۷ء

برباد لمحوں سے خطاب

رات آدھی آچکی ہے، خلقت ہے مصروفِ خواب
ابر کی ہلکی سی چادر میں ہے نُورِ ماہتاب
اپنے شانوں پر اٹھائے ہے پہاڑوں کا فشار
حاشیے پر شہر کے لانبے درختوں کی قطار!

دل پہ ہے کچھ اس طرح کی بیخودی چھائی ہوئی
بلشیز اس سے اُچٹ جاتی ہے نیند آئی ہوئی
ملگجی سی چاندنی، بکھرے سا ہلکا سا غبار
عرش سے تا فرش ہر ذرّہ ہے گویا سوگوار
ابر کے ٹکڑوں میں ہے اس طرح زہرہ کا جمال
یاس میں امید کا جس طرح مبہم سا خیال
یوں بجھا سا کچھ نظر آتا ہے گردوں کا چراغ
جسطرح آلام کے جھونکوں میں قندیلِ دماغ
دل میں پیدا ہو رہا ہے یوں خیال اندر خیال
جسطرح مطرب کے تانوں میں ہو ربط و اتصال
دل پہ طاری ہو چلا ہے جوشِ بیداری کا خواب
اُٹھ رہا ہے رفتہ رفتہ روئے ماضی سے نقاب
دورِ افتادہ رفیقوں کو ملا ہے اذنِ عام
ہو رہی ہے روح، بچھڑے دوستوں سے ہمکلام
آہ وہ برباد لمحے، زندگی کے گلستاں
ہائے وہ گم کردہ جلوے، نازشِ کون و مکاں
ہائے وہ رنگینیاں، نوخیز احساسات کی
ہائے وہ مست و جواں راتیں بھری برسات کی

وہ مذاقِ عشق و ذوقِ آشنائی ہائے ہائے
ہم زباں یاروں کی وہ رنگیں نوائی ہائے ہائے

آہ اے برباد لمحو! اے گزشتہ مہینو!
چھوڑ دو للہ اب، شاعر کا دامن چھوڑ دو
تم دلِ ناشاد کو اب شاد کر سکتے نہیں!
زخم جو ناسور بن جاتے ہیں بھر سکتے نہیں!
مفت میں بیٹھے بٹھائے خوں رلواتے ہو کیوں؟
اب اُن آخری صحبتوں کو یاد دلواتے ہو کیوں؟
مہربانی کے عوض بیداد کرنے آئے ہو!
چارہ سازی وقت کی برباد کرنے آئے ہو!
جاؤ، ورنہ صبر کی بنیاد تک ہل جائے گی
سعیِ ماہ و سال، دیکھو، خاک میں مل جائے گی

۱۹۲۷ء

آواز کی سیڑھیاں

کل جھٹپٹے کے وقت، کہ تھا زرد آفتاب
چھایا ہوا تھا عرصۂ ہستی پہ رنگِ خواب
ظلمت کی بڑھ رہی تھی اکاوٹ فضا کے ساتھ
اک راگنی سی بہہ رہی تھی ہوا کے ساتھ
ہر سانس پر شفق کا گریباں تھا چاک چاک
تھا اک خلا سا، وقت کے سینے میں ہیبناک
اتنے میں آئی دل کے صدائے طیور سے!
بن کے کسی فنکار کی اِک تان دور سے!
بے صرفہ جستجو کی کہانی لئے ہوئے!
اِک نو اسیرِ غم کی جوانی لئے ہوئے!
نا آزمودہ غم کی جبیں چومتی ہوئی!
تپتی ہوئی، لرزتی ہوئی اشک چومتی ہوئی!
بیگانہ رسمِ عیش کی فکرِ فضول سے
ملتی ہوئی غروب کی یادِ ملول سے

سنا ہوا سکوتِ لبِ جُو لئے ہوئے
دوشِ صدا پہ عشق کے آنسو لئے ہوئے

کچھ سُرخیِ شفق میں سیاہی سی آ گئی!
میدان پر اک اداس خموشی سی چھا گئی

ویرانہ فرطِ درد سے غمناک ہو گیا
اتنے میں کچھ ٹھہر کے، پھر آئی وہی صدا!

نغمے کی نبضِ سرد مکرر تپاں ہوئی!
گویا ٹھہر کے موج دوبارہ رواں ہوئی

پھر اس کے بعد تیز ہوئی تان دفعتہً
اللہ رے زور، گونج اٹھا گنبدِ کہن

اور اس کے بعد لحن کا دامن سمٹ گیا!
اور یوں صدا کا زور بتدریج گھٹ گیا

گویا سفید دودھ سی پتھر کی سیڑھیاں
پتلی، سبک، خنک، متناسب، گہر فشاں

تیشے سے زیر و بم کے ترش کر سنور گئیں!
ساحل سے تا بہ نہر، معلّق اُتر گئیں!

سنہ ۱۹۲۹ء

کلیوں کی بیداری

ہر اِک کلی، پھول بن رہی ہے، ہر اک خوشہ جھلک رہا ہے
چل رہی ہے نسیمِ بُستاں، تمام صحرا مہک رہا ہے!
تملاہ، نو لجہ کیے ہوئے ہے ہلال، تاروں کی انجمن میں
کھلا ہوا ہے فلک کا سینہ، زمیں کا غنچہ چٹک رہا ہے
ٹپک رہی ہے گلوں سے شبنم، لچک رہی ہیں ادا سے شاخیں
ہر اِک کلی تال دے رہی ہے، ہر اک طائر چہک رہا ہے
لپیٹے منہ سو رہی تھیں کلیاں، صبا نے آکر جو گدگدایا
سرک گئے ہیں سروں سے آنچل، تمام گلشن مہک رہا ہے

۱۹۳۵ء

بچھڑے ہوؤں کی یاد!

آ رہی ہے کیسو مئی کالی گھٹا مستانہ وار
مست ہے بادل کے پرتو سے کھجوروں کی قطار

سنبل و نسرین و سرو و یاسمن کے درمیاں
ہو رہی ہیں بادلوں کو دیکھ کر خوش قسمیاں

متصل ہونٹوں کے جام زندگانی آ گیا
ساقی لایا ابر و جام کے رشتے پہ پانی آ گیا

بیکسو اے یاران شہر اس بدبلا کا کیا علاج
ہو رہا ہے اپنے بستر سے مجھ کو اختلاج

اٹھ رہی ہے ہوک سی سینہ میں دل سا ہیں!
آہ وہ اپنے گھر، بچھڑے ہوؤں کی یادیں!

سنہ ۱۹۳۵ء

فاختہ کی آواز

آج تو فاختہ کی نرم آواز
ہے کچھ اس طرح غرقِ سوز و گداز

جیسے پیری میں یادِ طفلی آئے
جیسے جل جل کے شمع بجھ بجھ جائے

جیسے یعقوب، غرقِ شیون میں
جیسے سیتا کی جستجو بن میں

شب کو جس طرح دل میں درد اٹھے
بیوگی نوعروس کی۔ جیسے!

شام کو زیرِ سایۂ کہسار!
جیسے وادی میں دھیمی دھیمی پھوار

جیسے، جو بر نہ آئی ہو وہ مراد!
جیسے بھولے ہوؤں کی دل میں یاد

جیسے اشکوں کی لہر سینے میں
یاد آ نہ سکے جینے میں

جیسے سسرال میں کوئی لڑکی
دیکھ کر بدلیوں کو ساون کی

صبح، پنگھٹ کی نیم کے پیچھے
مائکے کی گھٹائیں یاد کرے

بجھا ہوا دل

جھٹپٹے کا وقت ہے آہستہ ہے موج ہوا
جھاڑیوں پر ایک سناٹا سا ہے چھایا ہوا
سامنے پل: راہ میں اڑتی ہوئی پھیکی سی خاک
پل کے نیچے سست چشمے کی صدا بے خوابناک
سامنے پامال سا اک مقبرہ، شاداب گھاس!
رات کے قدموں کی آہٹ، شام کی مرطوب سانس
جھاڑیوں پر سرخیاں، قبروں پہ بوجھل سا غبار
سر بزانو، کوہ و صحرا، آہ برلب، سبزہ زار
گھاس کی خوشبو میں، جنگل کی ہوا کا امتزاج
اور ہوا کی موج میں رفتار نبض اختلاج
سمت ویرانہ میں آبادی کی دھیمی سی صدا
خواب جیسے ذہن میں آئے کوئی بھولا ہوا
یا فسوں بھرنے کی خاطر دلربایانہ سیر میں
کہہ رہا ہو کوئی افسانہ زبان غیر میں۔

سرد ٹیسیں سی اٹھے ہے چپکے دل میں بدلتا ہے کوئی
سینۂ سوزاں کے ویرانے میں چلتا ہے کوئی

کچھ نہیں کھلتا کہ آخر دل بجھا جاتا ہے کیوں؟
اور اس بجھنے کی حالت میں مزا آتا ہے کیوں؟

۱۹۵۹ء

حُور کے اشارے

بھری برسات میں جس وقت بادل گھر کے آتے ہیں
بجھا کر چاند کی مشعل سیہ پرچم اڑاتے ہیں؟
مکاں کے بام و در پر بجلی کی رتیں جب جھلکتی ہیں
ٹپک بوندوں سے دروازے کے شیشے جب کھنکتے ہیں

سیاہی اتنی چھا جاتی ہے، جیسے ہستی کی محفل میں
تصور تک نہیں رہتا سحر کا، شام کے دل میں
امنگیں روح میں اٹھتی ہیں جب [illegible]
نشا جب [illegible] زخم کھاتی ہیں [illegible]

ستارے [illegible] آنکھ [illegible] ہیں
نیک [illegible] ایک [illegible] شاعر کی فطرت میں

کڑک سے آنکھ کھل جاتی ہے جب کمسن حسینوں کی
جھلک اٹھتی ہے موجِ برق سے افشاں جبینوں کی

ہوائے داستاں جب راگ ساون کے سناتی ہے
کسی کافر کی جب رہ رہ کے دل میں یاد آتی ہے

لبِ فطرت جب اتنے متصل ہوتے ہیں کانوں سے
کہ گونج اٹھتا ہے دل عشق و محبت کے فسانوں سے

سمٹ جاتی ہے جب بجلی، دکھا کر ابر سے جھلکی
فلک پر دفعتہً جب سانس رک جاتی ہے بادل کی

فلک پر نور کی جس وقت بنجاتی ہیں تصویریں
شگافِ ابر میں جب کانپنے لگتی ہیں تنویریں

نظر آتے ہیں کچھ شعلے سے جب ظلمت کے دامن میں
شکن بجلی کی جب تبدیل ہو جاتی ہے روزن میں

معاً اک حور اس روزن میں آکر مسکراتی ہے
اشاروں سے مجھے اپنی گھٹاؤں میں بلاتی ہے

۱۹۲۹ء

بن باسی بابو

جنگلوں کے سرد گوشے، ریل بل کھاتی ہوئی
جہل کے سینے پہ زلفِ علم لہراتی ہوئی

بزمِ وحشت میں سدن، ناز فرماتا ہوا
تند انجن کا دھواں، میداں پہ بل کھاتا ہوا

فطرتِ خاموش میں بھرتا ہوا سوز و گداز
صنعتِ پرکار کے چلتے ہوئے جادو کا ناز

الاماں دنیائے نادانی میں، دانائی کا زور
بھاپ کی پھنکار، لوہے کی گرج، پانی کا شور

متصل جھنکار سے، گونجی ہوئی خاموشیاں
پا بگل ویرانیوں میں نغمۂ شہرِ رواں

پھول گھبراتے ہوئے سہمے، پتیاں ڈرتی ہوئی
گرم پرندوں کی صدائیں، شوخیاں کرتی ہوئی

ایک اسٹیشن، افسردہ، مضمحل، تنہا، اداس
جھٹپٹے کی بدلیاں، پر ہول جنگل آس پاس

ملگجے سے اندھیری وادیاں، نیلی پھوار
بن گئے گرد و پیش کوسوں تک کھجوروں کی قطار
قدآدم گھاس، گہری ندیاں، اونچے پہاڑ
ایک بستی بس فقط ہے ذرے کے باقی سب اُجاڑ
کاش جاکر بابو جی اں سے تجسّس سے یہ پوچھے کوئی
جنگلوں میں کٹ رہی ہے کس طرح سے زندگی
پائی تھی کس شہر میں تعلیم؟ رہتے تھے کہاں
ساتھ کے کھیلے ہوؤں کا یاد ہے نام و نشاں
کس طرح طالع ہوئی تھی نوجوانی کی سحر؟
روز و شب کن صحبتوں میں عمر ہوتی تھی بسر؟
رات دن رہتا تھا جن کی دوستی سے دلکو کام
یاد ہیں کیا اب بھی ان مرجھائی ہوئی کلیوں کے نام
سچ کہو، اٹھتے ہیں جب بادل اندھیری راتوں میں
جب پپیہا کوک اٹھتا ہے کھری برسات میں
شہر میں ہوتا ہے گھنے جنگل میں جب بارش کا زور
سائیاں بھیگی ہوئی راتوں میں جب کرتا ہے شور
سچ تو اس فرطِ غم سے گھبرائی، نہیں!
تم کو اپنے عہدِ ماضی کی تو یاد آتی نہیں!

[illegible]

پیش گوئی

جھٹپٹے وقت کا ہے سناٹا
ابر چھایا ہوا ہے ہلکا سا،
شام کی تیرگی ہے ہیں مدھم!
دشت میں رہ روؤں کے نقش قدم
کس تکلف سے چل رہی ہے ہوا
جیسے کوئل کی نازنینوں میں صدا
دھیمی دھیمی ہواؤں کا ہے اثر
گھانس کے نیم نرم ریشوں پر

نور ظلمت پہ ہو رہا ہے فدا
کیا سلونی ہے جھٹپٹے کی فضا

دیر سے ایک گاؤں کی لڑکی
بھولی، بھالی، حسین چھوٹی سی
عمر ابھی جس کی دس برس کی ہے
ایک لکڑی کے پل پہ بیٹھی ہے
غور سے اک طرف جمائے نظر
رکھے رخسار کو ہتھیلی پر
سر پر آنچل پڑا ہے ساری کا
داہنے ہاتھ میں ہے جس کا سرا
نرم گردن میں خم، کلائی میں بل
ناک میں کیل، آنکھ میں کاجل
رخ پہ زلفیں، نگاہ میں بچپن
جیسے دھیمی ہوا میں گلشن؛
رخ پہ موجیں سی زندگانی کی
جھلکیاں طفلی و جوانی کی
کیوں ہیں گم ہوں اسے نہیں معلوم
یہ فراغت ہے کس قدر معصوم

ڈھیر ہیں زرد زرد پھولوں کے
سامنے جھنڈ ہیں ببولوں کے

شمع سی اک جلائے دیتی ہے
خود بخود مسکرائے دیتی ہے

کوئی دنیا میں کہہ نہیں سکتا
کیونکہ اس کا شباب گزرے گا

اس کے حالات شباب کیا ہوں گے
ہم تصور میں لا نہیں سکتے

اب بھی کہہ سکتے ہیں مگر اتنا
کہ اسے جب یاد آئے گا!

کہ مرے مانکے کے ویرانے
یوں سناتے تھے شب کو افسانے

کتنی دھومیں مچائی جاتی تھیں
کھیتیاں جب نکالی جاتی تھیں

شام ہوتی تھی کتنی خوش منظر
بیٹھتی تھی میں جا کے جب پل پر

صبح یوں روز مسکراتی تھی!
شام اس طرح گنگناتی تھی

ہوک سی اک اٹھے گی سینے میں
دل سے ٹپکیں گی خون کی بوندیں

نہ تو جاگے گی، اور نہ سوئے گی
دیر تک سر جھکائے روئے گی

۱۹۲۹ء

بدلی کا چاند

خورشید، وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشان لہرانے لگا
مہتاب، وہ ہلکے بادل سے، چاندی کے ورق برسانے لگا

وہ سانولے پن پر میداں کے، ہلکی سی صباحت دوڑ چلی
تھوڑا سا ابھر کر بادل سے، وہ چاند جبیں جھلکانے لگا

لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خطے دوڑ گئے
پل بھر نہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرانے لگا

بادل میں چھپا، تو کھول دیے، بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا، تو گردوں، دریا کی طرح لہرانے لگا

سمٹی جو گھٹا، تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا، تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غرفوں سے جھانکا گردوں کے، امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل، کہسار کا سر چکرانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسم دوڑ گیا!
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا

ابھرا تو تجلی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا، تو سیاہی دوڑا دی، سلجھا تو سونا برسانے لگا

کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے، کیا قید ہے، کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

۱۹۳۰ء

موجِ عرفان

ہوائے سرد ہے سرشار ہے کہیں دیسار
فضائے چرخ پہ چھایا ہوا ہے ابرِ بہار
کھڑا ہوا ہوں میں خاموش اک پہاڑی پر
مچل رہی ہے تمنا کہ پڑ رہی ہے پھوار!
غرورِ اہلِ دول جیسے چشمِ شاعر میں
پہاڑیوں سے نظر آ رہے ہیں یوں مینار
نہیں چمکتی ہے رہ رہ کے ابر میں بجلی
تڑپ رہی ہے یہ تھم تھم کے روحِ ابرِ بہار
بلند و پست چمکتی ہوئی چٹانوں پر
کھنک رہی ہیں یہ بوندیں کہ بج رہا ہے ستار
ہوائے نم کے تھپیڑے ہیں ارے معاذ اللہ!
دماغ گنگ ہے اور ہو رہا ہے دل بیدار
بساطِ منظرِ ہستی لپٹتی جاتی ہے
کہ اُٹھ رہا ہے بتدریج پردۂ اسرار!

زباں ہو جن کے تصور سے رعشہ بر اندام
تڑپ رہے ہیں مناظر ہیں وہ لطیف اشعار
بس اے ندیم! تجھے اب جوش کہہ نہیں سکتا
کہ حسنِ شاہدِ معنی سے ہے نگاہ دوچار

١٩٣٦ء

گاتی ہوئی راہیں

چھاؤں میں تاروں کی ملتی ہیں مجھے گاتی ہوئی
راہیں، کھیتوں کے کنارے پیچ و خم کھاتی ہوئی
کوہ و صحرا کو سناتی ہیں حدیثِ رنگ و بو!
پتلی پتلی ٹہنیوں پر قمریاں گاتی ہوئی!
اوس میں ڈوبی ہوئی چلتی ہے متوالی ہوا
کنج میں چھپتی ہوئی، غنچوں کو چٹکاتی ہوئی
پھوٹتی ہے عشوۂ ترکانہ سے پہلی کرن
نبضِ خار و خس میں خونِ گرم دوڑاتی ہوئی
چرخ سے آتی ہے رہ رہ کر صدا "روشن نگاہ"
خواب سے اٹھتی ہیں کلیاں ناز فرماتی ہوئی

پھوٹتی ہے یوں کرن جیسے کوئی کمسن عروس
آرہی ہو کھیلتی کنگن سے شرماتی ہوئی!

۱۹۲۳ء

دعائے سحری

علی الصباح کہ سنولا چلا تھا چہرۂ ماہ
بسانِ ارض و فضائے سما وتھی نرم و رقیق
رواقِ منظرِ گل تھا نشیمن فردوس
جبینِ ذرّۂ خاکی تھی جلوہ گاہ عقیق!
صبا کے رقص میں تھا لحن مطربانِ چمن
چمن کے صحن میں تھی الوے دوستانِ رفیق
افق پہ ساقیٔ فطرت کی جاں فروز شراب
چمن میں لالۂ احمر کا زر فشاں ابریق
صدائے نے سے پریشاں تھے شب روانِ جہاں
ردائے مہر سے لرزاں تھے قاطعانِ طریق
تجلیات میں تھی دفن، شورشِ حکمت
تخیلات میں تھا مردہ فتنۂ تحقیق

گرمی اور دیہاتی بازار

دوپہر، بازار کا دن، گاؤں کی خلقت کا شور
خون کی پیاسی شعاعیں، روح فرسا لو کا زور
آگ سی رو، کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب
تند شعلے، سرخ ذرے، گرم جھونکے آفتاب
شور، الجھن، غلغلہ، ہیجان، لو، گرمی، غبار
بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں، قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ، گڑ کی بو، مرچوں کی دھانس
خربوزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھاس
دھوپ کی شدت، ہوا کی یورشیں، گرمی کی رو
کملیوں پر سرخ حالوں ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جو
گرم ذروں کے شدائد، جھگڑوں کی سختیاں
جھگڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھواں
ماؤں کے کاندھے پہ بچے، گردنیں ڈالے ہوئے
بھوک کی آنکھوں کے تارے پیاس کے پالے ہوئے

ہجومِ نور سے سوزاں تھا دیدۂ تکذیب
نسیمِ صبح سے روشن تھی مشعلِ تصدیق!
بلند و پست کا ہر زیر و بم تھا ہم آہنگ!
حیات و موت کے ہر مسئلے میں تھی تطبیق
تڑپ رہی تھی فضاؤں میں کاوشِ ایجاد
رواں دواں تھا ہواؤں میں جذبۂ تحقیق
فلک کے دوش پہ غلطیدہ تھے رموزِ خفی
صبا کی موج میں رقصاں تھے نکتہ ہائے دقیق
یہ رنگ دیکھ کے بے ساختہ پکارا دل
کہ کاش جلوۂ جاناں میں ہو نہ اب تعویق
نزاکتِ دلِ اہلِ جنوں کا پاس کریں
بتانِ زہرہ جبیں کو خدا یہ دے توفیق!

-۹۲۰

بام و در لرزے ہوئے، خورشید کے آفات سے
ہر نفس، اک آنچ سی اٹھتی ہوئی ذرات سے
مرد و زن گردش میں، چیلوں کی صدا سنتے ہوئے
چلچلاتی دھوپ کی ردیں چھنے جھنتے ہوئے
میان سے موسم کی تیغِ بے اماں نکلی ہوئی
پیاس سے انسان و حیواں کی زباں نکلی ہوئی
لُو کے مارے بام و در کی روح گھبرائی ہوئی
دوستوں کی شکل پر بیگانگی چھائی ہوئی
یوں شعاعیں سایۂ اشجار سے چھنتی ہوئی
بے مروت کی سپاٹ آنکھوں کی جیسے روشنی
آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رم
بننے میں ممسک کا جیسے دغدغہ جود و کرم
ہر روش پر چڑچڑاپن، ہر صدا میں بے رخی
ہر جگہ گھٹتا ہوا، ہر جھونپڑی پکتی ہوئی
سر پہ کافر دھوپ، جیسے روح پر عکسِ گناہ
تیز کرنیں، جیسے بوڑھے سود خوروں کی نگاہ

۱۹۲۶ء

"اِک تارے" کا جادُو

برقِ پرور زندگی وابستہ صد پیچ و تاب
ابر کی باریک چادر، دوپہر کا آفتاب!
حاشیے پر شہر کے، اک باغ، ویران و تباہ
باغ کے دامن میں اک اجڑی ہوئی سی شاہراہ

گامزن اس راستے پر ایک پیرِ ناتواں
ہات میں "اکتارہ"، لب پر راگنی کی سسکیاں
تند رو جھونکوں کے شانے پر حرارت کا دباؤ
جن میں "اکتارے" کی آواز دلکش بے پروا بہاؤ

ارتعاشوں سے تار کی پھیکی فضا میں اک کسک
ابتدائے عشق میں جس طرح بنصوں کی دھمک
دے تو دے دل تشبیہ، لیکن کس کو آئے گا یقیں
آنسوؤں کی راگنی سے انجمن واقف نہیں

اس مزے کے ساتھ جاں افروز تانیں مضمحل
کردہ تھیں سینے میں سے جس کرب سے شاعر کا دل

یوں لرزتے ساز کے بے چین شعبے دل نشیں
پینگ سے جس طرح کوئی نغمۂ دنیا دربیں

انتروں میں جھٹپٹے کے وقت کی سی آب جو
زیر و بم کے لوچ میں رفتارِ نبضِ آرزو

راگنی کی نرم لہریں، جاگتی سوتی ہوئی
بہہ رہی ہیں پردہ ہائے دل سے مس ہوتی ہوئی

ذرہ ذرہ اک نئے سانچے میں ڈھلنے کے قریب
عالمِ اسباب ہے گویا پگھلنے کے قریب

۱۹۲۶ء

رقیب فرشتے

صبح کے تارے سے تھی گلرنگ گردوں کی جبیں
مست تھی موجِ صبا، کلیاں ابھی چٹکی نہ تھیں
آسماں پر کیف طاری تھا، زمیں پر بے خودی
جھک چلا تھا چاند، پھیکی پڑ چلی تھی چاندنی

ایک ہلکا سا تبسم تھا در و دیوار پر!
جیسے چھٹی نیند کا جادو رخِ گلنار پر!
گر رہے تھے گنبدِ افلاک سے بے اختیار
خاک پر سیال چاندی کے ہزاروں آبشار
آرہی تھی نرم قدموں سے نسیمِ دل نواز
سرنگوں تھے بوستاں، کلیاں تھیں محوِ خوابِ ناز
صبح کے چہرے پہ تھی ہلکے دھندلکے کی نقاب
گا رہا تھا بھیرویں، بیٹھے سروں میں ماہتاب
آرہی تھی آسمانوں سے فرشتوں کی صدا
کیا سہانا وقت ہے صلی علیٰ صلی علیٰ
ان صداؤں سے مگر میں کھا رہا تھا پیچ و تاب
ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ابھرا آفتاب
شکر کے سجدے کیے میں نے کہ دشمن بہہ گئے
خیریت گزری، کہ قصے بڑھتے بڑھتے رہ گئے!
میری معشوقہ پہ یہ بے عقل، مرنے آئے تھے
کیا سمجھ کر صبح کی تعریف کرنے آئے تھے
میں تھا جب موجود، پھر یہ گانے والے کون تھے
میری سرحد میں فرشتے آنے والے کون تھے

۱۹۲۹

آثارِ جمال

ابر کے ٹکڑے نہیں، سبزہ کی زیبائی نہیں
وہ مناظرِ خوش ہو جس سے عام بینائی نہیں
خشک چٹیل، کھردرا میدان تا حدِّ نگاہ
زرد، مرجھائی، مضمحل، البتہ خشک، بے رونق تباہ
ہر طرف اک منظرِ افسردگی، کلیاں، نہ پھول
چند سوکھی جھاڑیاں، اک آدھ بے پروا ببول
جابجا اجڑے ہوئے پامال کھیتوں کے نشاں
چھپ چکی ہیں عارضِ عالم میں جن کی سرخیاں
خوں تھا جن کا نقوشِ مدعا کے واسطے
مٹ چکے تھے جو تمدن کی بقا کے واسطے
گاؤں کے شبنموں سے اڑ کر جیسے جلوؤں کی شراب
بن چکی ہے دخترانِ شہر کے چہروں پہ آب
چھپ چکی ہیں ختم، مگر اس خاک کی رنگینیاں
چشمِ شاعر پہ مگر اب بھی ہیں کچھ جلوے عیاں

اب بھی غلطاں ہے یہاں، دیکھو اے نگاہِ نکتہ یاب
پھول چننے والیوں کا تند، متوالا شباب!
گیت کھیتوں کی منڈیروں پر کبھی گائے ہوئے
بکھر رہے ہیں صحنِ خاموشی میں گھبرائے ہوئے
جذب ہے اس خار و خس میں موسمِ گل کا گداز
دفن ان ذروں میں ہیں نوخیز چرواہوں کے راز
کتنی تانوں کے یہاں منڈلا رہے ہیں زیر و بم
سو رہے ہیں کس قدر اس خاک میں نقشِ قدم
دخترانِ دشت کی رنگینیاں ہیں جلوہ گر!
کھیتیوں کے، آنکھ جھپکاتے ہوئے آثار پر
اس فضا میں ابر کی ہے جس کو یاد آئی ہوئی
بکھر رہی ہے غنچگی کی روح گھبرائی ہوئی
رنگ و بو ہے عہدِ رنگیں کے گزر جانے کے بعد
کہہ رہے ہیں خار و خس، افسانہ، افسانہ کے بعد

سنہ ۱۹۲۵ء

ذی حیات مناظر

خامشی دشت پہ جس وقت کہ چھا جاتی ہے
عمر بھر جو نہ سنی ہو وہ صدا آتی ہے
بھینی بھینی سی مچلتی ہے فضا میں خوشبو!
ٹھنڈی لب ساحل سے ہوا آتی ہے؛
دشت خاموش کی اجڑی ہوئی راہوں سے مجھے
جادہ پیماؤں کے قدموں کی صدا آتی ہے
پاس اگر مرے گاتی ہے کوئی زہرہ جمال
اور گاتی ہوئی پھر دور نکل جاتی ہے
آنکھ اٹھاتا ہوں تو خوش چشم نظر آتے ہیں
سانس لیتا ہوں تو احباب کی بُو آتی ہے
دشنہ رکھ دیتا ہے گھبرا کے رگ جاں پہ کوئی
جب کلی خاک پہ دم توڑ کے گر جاتی ہے
مسکراتی ہے جو رہ رہ کے گھٹا میں بجلی
آنکھ سی کوہ بیاباں کی جھپک جاتی ہے

کرنے لگتے ہیں نظارے سے جو بادل مایوس
برق آہستہ سے کچھ کان میں کہہ جاتی ہے

جھاڑیوں کو جو ہلاتے ہیں ہوا کے جھونکے
دلِ شبنم کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

مجھ سے کرتے ہیں گھنے باغ کے سائے باتیں
ایسی باتیں کہ مری جان پہ بن جاتی ہے

گنگناتے ہوئے میدان کے سناٹے ہیں
آپ ہی آپ طبیعت مری بجھ جاتی ہے

یوں نباتات کو چھوتی ہوئی آتی ہے ہوا!
دل میں ہر سانس سے اک پھانس سی چبھ جاتی ہے

جب ہری دوب کے مڑ جاتے ہیں نازک ریشے
شیشۂ قلب میں اک ٹھیس سی لگ جاتی ہے

بانسری جیسے بجاتا ہو کہیں دور، کوئی ... !
یوں دبے پاؤں بیاباں سے ہوا آتی ہے

حسرتیں خاک کی غنچوں سے ابل پڑتی ہیں
روحِ میدان کی پھولوں سے نکل آتی ہے

طبعِ شاعر کو، روانی کا اشارہ کر کے
نہر شاخوں کے گھنے سائے میں سو جاتی ہے

ان مناظر کو میں بے جان سمجھ لوں کیوں کر؟
جوشؔ! کچھ عقل میں یہ بات نہیں آتی ہے۔

گھٹا

اٹھی گھٹا، وہ رنگ و بو کا، کارواں لئے ہوئے
جلو میں کائنات کی، جوانیاں، لئے ہوئے!
لئے ہوئے پیام جاں، ہر ایک رس کی بوندیں
ہر ایک رس کی بوندیں پیام جاں لئے ہوئے
لئے ہوئے ہوا کے نرم بازوؤں پہ بوستان
ہوا کے نرم بازوؤں پہ بوستاں لئے ہوئے
دھواں دھواں لئے ہوئے بلندیوں پہ چرخ
بلندیوں پہ چرخ کی دھواں دھواں لئے ہوئے
زمیں تشنہ کام کی جماہیوں کے سامنے
شراب لالہ رنگ کی گلابیاں لئے ہوئے
وفورِ سوز و ساز میں، ہجوم پیچ و تاب سے
رنگیں و نرم دامنوں میں بجلیاں لئے ہوئے
ہر ایک سو رواں دواں، کبھی یہاں کبھی وہاں
زبانِ شوخ و شنگ کی سی شوخیاں لئے ہوئے

صدائے برق و رعد ہیں، ہوائے تند و تیز ہیں
نزاعِ عشق و ہوش کی کہانیاں لئے ہوئے

ہوائیں اینٹھتی ہوئی فضائیں جھومتی ہوئی
تحمل و شکیب کی تباہیاں لئے ہوئے

بہشتِ حسن و عشق کو، جہانِ رقص و کیف کو
فضائے آب و رنگ میں کشاں کشاں لئے ہوئے

حریمِ کیف و سرخوشی ہیں، پردہ ہائے رنگ میں
سبو بدوش مغبچوں کی مستیاں لئے ہوئے!

ادا و ناز و دلبری کی رنگ ریز چھاؤں میں!
نئی نئی جوانیاں کی جھلکیاں لئے ہوئے

لئے ہوئے ہواؤں پر سیاہ و سرخ کشتیاں
ہوائے تند کشتیوں کے بادباں لئے ہوئے

لئے ہوئے بلندیوں پہ ولولے حیات کے
حیات بخش ولولے بلندیاں لئے ہوئے

سیاہیوں کے سلسلے ہیں، تیرگی کی موج ہیں
جنوں فروش کاکلوں کی داستاں لئے ہوئے

کدھر ہے جوش! بدلیاں رواں ہیں سوئے میکدہ
سیاہیوں کے حاشئے پہ سرخیاں لئے ہوئے

۱۹۳۱ء

موہوم آواز

فلک پر رات کو چھائی ہوئی تھیں بدلیاں ہمدم،
ہوا نمناک تھی۔ میداں تھا غمگیں، چاندنی مدھم:
مہ تاباں کی کشتی، آسماں تھم تھم کے کھیتا تھا!
ہجوم زرد سے، رک رک کے میداں سانس لیتا تھا
گھٹائیں چاند کو پیہم جلاتی تھیں، بجھاتی تھیں
تمناؤں کی شمعیں، طاق دل میں جھلملاتی تھیں
بلا کی الجھنیں تھیں، مضمحل میداں پہ طاری تھی:
تجلی سے کبھی ہلکا، سیاہی سے کبھی بھاری تھی!
رواں مشرق سے مغرب کی طرف، امڈے ہوئے بادل
ہوا کی سنسناہٹ، بادل کی جنبش، چاند کی ہلچل
ہجوم تیرگی سے تھی وہ حالت ماہ پر دیں کی
رخ رنگیں پہ جیسے جھلکیاں سی خواب نوشیں کی
گھٹاؤں میں سے نکلے تیر ملے ہوئے یوں چاند کے گوشے
دلِ توبہ شکن میں، ذوقِ استغفار ہو جیسے

نظر آتا ہے گھبرایا ہوا، بادل، چاند، بادل میں
کوئی سہمی ہوئی دوشیزہ جیسے شب کو جنگل میں
ہجوم ابر سے مجروح تھی بادل چاند کی شوخی
کہ جیسے عظمت شاعر کے حق میں زندگی اس کی
گھٹائیں اور گھٹاؤں کے شگافوں سے صنم کاری
نظارہ نیند کا اور نیند میں ہلکی سی بیداری
تگ و دو کا ہوا، جب حکم دیتی تھی اشاروں سے
گنگنانا لہرا دیتی تھی جھک کر کوہساروں سے
جنوں انگیز و نامعلوم، ان لمحوں کی طغیانی
نہ پوچھ اے ہمنشیں! اس وقت کی آشفتہ حالی
لب خاموش میں ہونا، کسی کا نام لیتا تھا
کوئی رہ رہ کے دل کو دار رسے آواز دیتا تھا

۱۹۳…ء

جذباتِ فطرت

پہاڑ کی صدا

مری وادی میں ہے پھولوں کی دنیا
اُبلتا ہے مرے پہلو سے چشمہ
مرے دامن میں ہے شفاف دریا
مری چوٹی پہ ہے قدرت کا تماشا
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

دریا کی صدا

مری لہروں میں بجلی کا خزانہ
مری رَو میں نُجبت کا فسانہ
مرے دھارے میں منزل کا ترانہ
مرے گرداب میں چنگ و چغانہ
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

طلوعِ سحر کی صدا

مرے آئینہ میں تصویرِ جاناں
مرے دربار میں حوریں غزلخواں
مرے رخسار میں انوارِ ایماں
مرے اوراق میں اسرارِ عرفاں
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

غروبِ آفتاب کی صدا

مری تاریکیوں میں یاس و حرماں
گداز دل کے لمحوں میں ساز و ساماں
مری سرخی میں دو دِ برقِ پنہاں
خموشی سے مری سنسان بیاباں
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

ستارۂ سحری کی صدا

پجاری ہیں مرے "فطرت" کے عاشق
مری ضو، وقتِ نازک کے مطابق!
مرا ہلکا سا پرتو، جانِ مشرق!
عیاں مجھ سے جبینِ صبحِ صادق
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

شفق کی صدا

مرے عارض میں کندن کی دمک ہے
مری چادر میں کوندے کی لپک ہے
مرے سینے میں عرفاں کی جھلک ہے
مرے آغوش میں تاجِ فلک ہے
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

چاند کی صدا

زمیں دامن ہے مجھ سے منور
بچھی ہے نور کی ہلکی سی چادر
خنک مجھ سے گل اندامول کے بستر
مری ضو سے جھلکتا ہے سمندر
ادھر آ، آ اے مرے شاعر ادھر آ

آفتاب کی صدا

فلک پر دائرہ میرا مزین
سحر کے ہاتھ میں سونے کا کنگن
کرن میری نگاہ شوق دیرفن
مرے آتے ہی جاگ اٹھتے ہیں گلشن
ادھر آ، آ اے مرے شاعر ادھر آ،

آدھی رات کی صدا

مرے تاروں کی گردش سازِ عشرت
مری خاموشیوں میں عقل و حکمت
تصورِ دوست کا، میری بدولت،
قلم رَد سے مری خارج ہے محنت
ادھر آ، اے مرے شاعر ادھر آ

فصلِ گل کی صدا

مری محفل میں بلبل کا ترانہ
دلوں کی زندگی، میرا فسانہ
ہوائیں میری، خوشبو کا خزانہ
محبت خیز ہے میرا زمانہ :
ادھر آ، اے مرے شاعر ادھر آ

سمندر کی صدا

مری موجوں میں مضطر روحِ طوفاں
مرے سینے میں جوشِ ابرِ باراں
مری تہ میں ہزاروں رازِ پنہاں
مری تشریح میں ہر عقل حیراں
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

پھول کی صدا

چمن کا حسن ہوں گلشن کا زیور
مرا عاشق ہے جوشِ روح پرور
مری ہر پنکھڑی نرم و معطر!
مرے کانوں میں ہیں شبنم کے گوہر
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

گریۂ مسرّت

آج تڑکے، الحفیظ والاماں!
دوستو! عثمان ساگر[1] کا سماں!

دیدنی تھی نرم پوروں کی لچک
بدلیاں چھائی ہوئی تھیں دور تک

ظلمتیں تھیں نور سے گرمِ ستیز
ولولوں پر تھی ہوائے تند و تیز!

سامنے تھیں پتھروں کی حسرتیں
نرم و نازک جھاڑیوں کی شکل میں

جزر و مد میں تھی بفرطِ اضطراب
سامنے عثماں ساگر کی شراب

روحِ طوفاں در بغل، کف در دہاں
دوستو، کس طرح تھیں موجیں رواں

جھاگ اڑاتی، پھاندتی، اڑتی ہوئی!
چیختی، سر پھوڑتی، بپھری ہوئی!

چلبلی، ابھری ہوئی، نکھری ہوئی
چیختی، سر پھوڑتی، بپھری ہوئی

بجلیاں دامن میں چمکاتی ہوئی
دم بدم آتی ہوئی، جاتی ہوئی

اس طرف سے اس طرف ہوتی ہوئی
پتھروں کو چھانٹتی، دھوتی ہوئی!

گرتی پڑتی، مست، سر دھنتی ہوئی
مرتعش، قالین سا بنتی ہوئی!

زیر و بم کا تار دکھلاتی ہوئی!
اُٹھ کے بڑھتی، گر کے ٹکراتی ہوئی

گنگناتی، صف بہ صف آتی ہوئی
لڑتی، بھڑتی، گونجتی، گاتی ہوئی

---

[1] حیدرآباد کا ایک روح پرور تالاب ۱۲

مچھلیوں کو درسِ غم دیتی ہوئی! ہچکیوں پر ہچکیاں لیتی ہوئی؟!
ساحلِ رنگیں سے ٹکراتی ہوئی اینڈتی، اٹھلاتی، بل کھاتی ہوئی
دم بدم ہنستی ہوئی روتی ہوئی ملتی، کتراتی، جدا ہوتی ہوئی
جابجا دلدل میں کاجل پارتی چوکڑی بھرتی چھلانگیں مارتی
چپے چپے غاروں کے اندر گھومتی ناچتی، حلقے بناتی، جھومتی
بلبلاتی، بھاگتی، منہ موڑتی مڑ کے پھر ساحل پہ موتی توڑتی
گاتی، لہراتی، گرجتی، ہانپتی! ڈرتی، بڑھتی، سمٹتی، کانپتی!

تو کہے دریا میں تھا غرقِ نمو!
یا رگِ کڑیل جوانی کا لہو!

یہ سماں تھا، اور اک رنگیں پرند روحِ شاعر کی طرح بے قید و بند
بے خودی کے جام چھلکاتا ہوا گزرا میرے پاس سے ہنستا ہوا

نغمہ سن کر اس قدر جی خوش ہوا
ہچکیاں لے لے کے میں رونے لگا

١٩٣٢ء

اسلامیات

کفرے چو منے گزاف آساں نہ شود
محکم تر از ایمانِ من ایماں نہ شود
در دہر چو من یکے و آنہم کافر
پس در دو جہاں یکے مسلماں نہ شود

(یہ تمام نظمیں ۱۹۲۷ء تک کی ہیں)

ہاں، خود و زرہ بھی تو ہے اسلام کا زیور
باندھے گا فقط جامۂ احرام کہاں تک

(جوشؔ)

اے خدا

اے خدا! سینۂ مسلم کو خطا ہو وہ گداز
تھا کبھی حمزہؓ و حیدرؓ کا جو سرمایۂ ناز
پھر فضا میں تری تکبیر کی گونجے آواز!
پھر اس انجام کو دے گرمیٔ روحِ آغاز!

نقشِ اسلام اُبھر جائے، جلی ہو جائے
ہر مسلمان حسینؓ ابن علیؓ ہو جائے

دشتِ اسلام کے کانٹوں کو گلستاں کر دے
پھر ہمیں شیفتۂ جلوۂ ایماں کر دے
دل میں پیدا تپش بوذرؓ و سلماںؓ کر دے
اپنے محبوب کی سوگندہ مسلماں کر دے

رو کشِ صبح شبِ تار کا سینہ ہو جائے
آبگینے کو وہ چمکا کہ نگینہ ہو جائے

دے ہمیں بار خدا! جرأت و ہمت کی صفات!
دل کو یوں چھیڑ کہ پھر جاگ اُٹھیں احساسات
پھر سے ہوں تازہ رسولِ عربی کے غزوات
درس مومن کو یہ دے موت سے تکمیلِ حیات

جادہ پیمائی کو چھوڑا ہوا صحرا دیدے
قیس کو پھر غلش ناقۂ لیلیٰ دے دے
پھر بہار آئے، ہمہ تن تاب پری ہو جائے!
پھر جہاں محشر صد جلوہ گری ہو جائے
دیے وہ چھینٹے کہ ہر اک شاخ ہری ہو جائے
زور آندھی کا نسیم سحری ہو جائے
طبع افسردہ کو پھر ذوق روانی دیدے
اس زلیخا کو بھی معبود جوانی دیدے

تدابر

ہم کو سمجھا کہ تلاطم میں ٹھہرنا کیا؟
نشۂ بادۂ جرأت کا اترنا کیا؟
موت کیا شے ہے، بھلا موت سے ڈرنا کیسا؟
کوئی اس راہ میں مرتا بھی ہے مرنا کیسا؟
مر کے بھی خون میں یوں موج بقا آتی ہے
کہ اجل سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے
صبح اسلام پہ ہے تیرہ شبی کا پر تو
لب مسلم سے ہٹا تشنہ لبی کا پر تو
کاٹ کر ماندہ و راحت طلبی کا پر تو!
ڈال سینوں میں رسول عربی کا پر تو!
غل ہو کہ وہ حوصلۂ شوق دوبارہ نکلا
وہ چمکتا ہوا اسلام کا تارہ نکلا

زندہ کس طور سے رہتے ہیں بتا دے ہم کو
عقل حیران ہو وہ دیوانہ بنا دے ہم کو
سوئے بتخانۂ توحید صدا دے ہم کو
عشق کا ساغرِ لب ریز پلا دے ہم کو
کج ہوا اس وقت سرِ حشر کلاہیں اپنی
جب ملیں ساقیٔ کوثر سے نگاہیں اپنی

ذاکر سے خطاب

اول ''ذاکر'' بدبخت اور غلام ہندوستان کا، جو خود اپنی وسعت سے برباد اور اپنے ہی بوجھ کے نیچے کچلا ہوا ہے ایک ایسا سست رگ اور زہر بر فطرت فرد ہے، جو اول واقعات کربلا کو صحت و عام صحت سے بے نیاز ہو کر اور روح شہادتِ امام سے بیگانہ رہتے ہوئے ماہِ محرم کی مجلسوں میں محض اِسلئے بیان کرتا ہے کہ سامعین روتے روتے بیہوش ہو جائیں

دوم فیس کیساتھ ساتھ ''انعام'' و ''تحائف'' کیواسطے بھی غیر ملفوظ طور سے مُصر ہوتا ہے۔

سوم اِس شدت کیساتھ رُلانے کی، اچھی طرح مول تول کر کے فیس بھی لیتا ہے

چہارم اِس ناجائز اور اِن ناروا تحائف کو شرمناک جمود اور عبرت انگیز بے حسی کے ساتھ اپنے ہی نفس کی خاطر دوسرے محرم تک صرف کرتا رہتا ہے۔

پنجم ملت کو بیدار کرنیکے عوض تھپکیاں اور لوریاں دیتا ہے اور فاتح و جنگجو بنانے کے بدلے بزدل و مظلوم بنانے کی سعی میں سرگرم رہتا ہے۔

ششم شہید اعظم کی قربانی کے مغز اور روح کو خلقت کی نظروں سے بصد ہزار اہتمام مخفی رکھتا ہے

ہفتم حق کی طرف ملتفت نہیں ہوتا اور باطل سے بیحد ڈرتا ہے۔

ہشتم اور اپنے اِن خدمات کا صلہ پانے کے لئے آستانِ حکومت پر بھی ناصیہ فرسائی کرتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔

ہوشیار اے ذاکرِ افسردہ فطرت! ہوشیار
مردِ حق اندیشہ، اور باطل سے ہو زار و نزار
ضعف کا احساس، مومن کو یہ کیا خلفشار!
لَا فَتیٰ اِلَّا عَلِیؓ، لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار!

جو حسینی ہے، کسی قوت سے ڈر سکتا نہیں
موت سے ٹکرا کے بھی سادات مر سکتا نہیں
تو نہیں روحِ شہیدِ کربلا سے بہرہ مند
تیرے شانوں پر تو زلفِ بزدلی کی ہے کمند!

سخت استعجاب ہے اے پیشہ ور ماتم پسند
پیروِ ضیغم کے سینے میں ہو قلبِ گوسفند!
ننگ کا موجب ہے یہ اہلِ دغا کے واسطے!
یوں نہ ماتم کر شہیدِ کربلا کے واسطے

مانعِ شیون نہیں میرا پیامِ مستقل!
گریہ فطری شے ہے، دشمن پر بھی بھر آتا ہے دل
دل نہیں پتھر ہے، مولیٰ پر نہ ہو جو مضمحل!
گریۂ مومن سے ہے تزئینِ بزمِ آب و گل!

کون کہتا ہے کہ دل کے حق میں غم اچھا نہیں
پھر بھی شغلِ گریہ نصب العین بن سکتا نہیں

ہاں میں واقف ہوں کہ آنسو ہے وہ تیغِ آبدار
سنگ و آہن میں اتر جاتی ہے جسکی نرم دھار
ہے مگر مردانگی کو اُن خنکِ اشکوں سے عار
جنکے شیشوں میں نہ غلطاں ہوں شجاعت کے شرار

اشک بے سوزِ دروں پانی ہے، ایمانکی قسم
قلبِ شبنم پر شعاعِ مہرِ تاباں کی قسم

سوچ تو اے ذاکرِ افسردہ طبع و نرم خو!
آہ تو نیلام کرتا ہے شہیدوں کا لہو!
تاجرانہ مشق ہے مجلس میں تیری ہاؤ ہو
فیس کا دریوزہ ہے منبر پہ تیری گفتگو
عالمِ اخلاق کو زیر زبر کرتا ہے... تو!
خونِ اہلبیت میں لقمے کو تر کرتا ہے تو

حرص نے تجھ کو سکھایا ہے دنائت کا سبق
کربلا کے ذکر میں لیتا نہیں کیوں نامِ حق
چشمۂ دولت ہے تیرا سیلِ اشکِ بے قلق
خون کی چادر سے سونے کے بناتا ہے ورق
خانۂ برباد ہے دولت سرا تیرے لئے
اک دفینہ ہے زمینِ کربلا تیرے لئے

کیا بتاؤں، کیا تصوّر تو نے پیدا کر دیا
عیز رِ نا حق کو بھلا کر، حق کو رسوا کر دیا
کربلا، دخولِ سولی کو تماشا کر دیا
"آب رکنا باد" دلبستانِ "مصلّے" کر دیا
مشقِ گریہ، عیش کی تمہید ہے تیرے لئے
عشرۂ ماہِ محرم، عید ہے تیرے لئے
سوچ تو جی میں اے مشتاقِ راہِ مستقیم
مومنوں کے دل ہوں اور درماندۂ امید و بیم
شدتِ آہ و بکا سے دل ہو سینہ نہیں دو نیم
کیوں یہی لے دے کے تھا کیا مقصدِ ذبحِ عظیم
خوف ہے قربانیٔ اعظم نظر سے گر نہ جائے
ابنِ حیدر کے لہو پر، دیکھ، پانی پھر نہ جائے
سازِ عشرت ہے تجھے ذکرِ امامِ مشرقین
ڈھالتا ہے تیرے سکے، پستگانِ غم کا بین
تیری دار الضرب ہے اہلِ عزا کا شور و شین
سر جھکا لے شرم سے اے تاجرِ خونِ حسینؑ
ذہن میں آتا ہو جس کا نام تلوار کے ساتھ!
اس کا ماتم اور ہو سکّوں کی جھنکار کے ساتھ

غم کے سکے ہائے زر تا گے بٹھائے جائینگے
کب تک آخر ہم پئے عشرت رلائے جائینگے
دام پر تا چند یوں دانے گرائے جائینگے
آنسوؤں سے تا کجا "موتی" بنائے جائینگے

بہرِ لقمہ تابہ کے منبر پہ منہ کھولے گا تو؟
تا کجا پانی کے کانٹے پر لہو تولے گا تو؟

کربلا میں اور تجھ میں اتنا بُعد المشرقین
اس طرف شورِ رجز خوانی، ادھر ہے کیے بین
اس طرف تکبیر ادھر ہنگامہائے شور و شین
اس طرف اشکوں کا پانی اس طرف خونِ حسینؑ

وہ ہے کس منزل میں، اور تو کونسی منزل میں ہے
شرم سے گڑ جا اگر احساس تیرے دل میں ہے

کربلا سے واقفیت بھی ہے مردِ منفعل؟
کربلا در پردہ بشاش، اور بظاہر مضمحل؟
جس کی رفعت سے بلندی آسمانوں کی خجل
جس کے ذروں میں دھڑکتے ہیں جوانمردوں کے دل

خندہ زن ہے جس کی رفعت گنبدِ افلاک پر
مہرِ تکمیلِ نبوت ثبت ہے جس خاک پر

جس کے ہر ذرے میں غلطاں ہیں ہزاروں آفتاب
خار کی نبضوں میں جاری ہے جہاں خون گلاب
جس کے خار و خس میں ہے خوشبوئے آلِ بوتراب
کربلا! تاریخِ عالم میں نہیں تیرا جواب!

کربلا! تو آج بھی قائم ہے اپنی بات پر
ہر اب بھی سجدہ کرتا ہے ترے ذرات پر
اے چراغِ دودمانِ مصطفٰےؐ کی خوابگاہ
تیرے خار و خس پہ ہے تابندہ خون بیگناہ

تیری جانب اٹھ رہی ہے اب بھی یزدانی نگاہ
آ رہی ہے ذرّے ذرّے سے صدائے لا الٰہ
اے زمیں! خوش ہو کہ تیری زیب و زینت ہے حسینؑ
تیرے سناٹے میں محوِ خوابِ راحت ہے حسینؑ

جو دہکتی آگ کے شعلوں پہ سویا، وہ حسینؑ
جس نے اپنے خون سے عالم کو دھویا وہ حسینؑ
جو جواں بیٹے کی میت پر نہ رویا، وہ حسینؑ
جس نے سب کچھ کھو کے پھر کچھ بھی نہ کھویا وہ حسینؑ

مرتبہ اسلام کا جس نے دو بالا کر دیا
خون نے جس کے دو عالم میں اجالا کر دیا

نطق جس کا نغمۂ سازِ پیمبر، وہ حسینؑ
تھا جو شرحِ مصطفےٰ، تفسیرِ حیدر، وہ حسینؑ
تشنگی جس کی جوابِ موجِ کوثر، وہ حسینؑ
لاکھ پر بھاری رہے جس کے بہتّر، وہ حسینؑ
جو محافظ تھا خدا کے آخری پیغام کا!
جس کی نبضوں میں مچلتا تھا لہو اسلام کا
ہنس کے جس نے پی لیا جامِ شہادت، وہ حسینؑ
مر گیا لیکن نہ کی فاسق کی بیعت، وہ حسینؑ
ہے رسالت کی سپر جس کی امامت، وہ حسینؑ
جس نے رکھ لی نوعِ انسانی کی عزت، وہ حسینؑ
وہ کہ سوزِ غم کو، سانچے میں خوشی کے ڈھال کر
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
اے حسینؑ! جب تک گل افشاں ہے تری ہمت کا باغ
آندھیوں سے لڑ رہا ہے آج بھی تیرا چراغ
تو نے دھو ڈالا اے جبینِ ملت بیضا کے داغ
تیرے دل کے سامنے لرزاں ہے باطل کا دماغ
فخر کا دل میں دریچہ باز کرنا چاہیے
جس کا تو آقا ہو، اس کو ناز کرنا چاہیے

کھول آنکھیں اے اسیرِ کاکلِ زشت و نکو
آہ کن موہوم موجوں پر بہا جاتا ہے تو
ختم ہے آنسو بہانے ہی پہ تیری آرزو
اور شہیدِ کربلا نے تو بہایا تھا لہو!

ہات ہے ماتم میں تیرا سینۂ افگار پر
اور حسینؑ ابن علیؑ کا ہات تھا تلوار پر

تھیں بہتر خوں چکاں تیغیں حسینی فوج کی
اور صرف اک سیدِ سجاد کی زنجیر تھی
اتنی تیغوں کی رہی دل میں نہ تیرے یاد بھی
حافظے میں صرف اک زنجیر باقی رہ گئی!

ذہن کو بے چارگی سے انس پیدا ہو گیا
اشجعِ عالم کے پیرو! یہ تجھے کیا ہو گیا
آہ تو اور ساز و برگِ عافیت کا اہتمام
کیوں نہیں کہتا کہ باطل کی حکومت ہے حرام

تجھ کو اور زنداں کا ڈر، کیوں اے غلامِ ننگ و نام
جانتا ہے رہ چکے ہیں قید میں کتنے امام!...
تو مثالِ اہلِ بیتِ پاک مر سکتا نہیں
عشق کا دعویٰ ہے اور تقلید کر سکتا نہیں

دیکھ مجھ کو دیکھ میں ہوں ایک رندِ بادہ خوار!
رسمِ تقویٰ ہی سے واقف ہوں، نہ طاعت سے دوچار

سر پہ ہے شملہ، نہ کاندھے پر عبائے زرنگار
موت کو لیکن سمجھتا ہوں، حیاتِ پائدار

رسمِ راہِ زہد و تقویٰ کو سبک کرتا ہے تو!
قتل سے ڈرتا نہیں ہے، قید سے ڈرتا ہے تو

خوف کا جن ہے زمانے سے ترے سر پر سوار
خوف ہے اک نامبارک طائرِ مردار خوار

باغِ دلبستاں سے نہیں ہوتی، ملتفت جسکی نگاہ
روز و شب لاشوں پہ منڈلاتا ہے جو دیوانہ وار

تیرے سر پر اس کا منڈلانا تماشا تو نہیں؟
غور کر تو، کہ عفونت خیز لاشا تو نہیں؟

خلق میں محشر بپا ہے! اور تو مصروفِ خواب!
خون میں ذلت کی موجیں کھا رہی ہیں پیچ و تاب

تیری غیرت کو خبر بھی ہے، کہ دشمن کا عتاب
تیری ماں بہنوں کی راہوں میں الٹتا ہے نقاب

اب تو زخمی شیر کی صورت بپھرنا چاہیے
یہ اگر ہمت نہیں، تو ڈوب مرنا چاہیے

دیکھ تو کتنی مکدّر ہے فضائے روزگار
کس طرح چھایا ہوا ہے، حق پہ باطل کا غبار
بزمِ یزدانی میں، روحِ اہرمن ہے گرمِ کار
میان سے باہر ابل پڑ، اے علیؑ کی ذوالفقار

نقشِ حق کو اب بھی اے غافل! بھی کرتا نہیں
اب بھی تقلیدِ حسینؑ ابن علی کرتا نہیں

اے مرتضیٰ

اے مرتضیٰ مدینۂ علمِ خدا کے باب
اسرارِ حق ہیں، تیری نگاہوں پہ بے نقاب
اے تیری چشمِ فیض سے اسلام کامیاب
ہر سانس ہے مکارمِ اخلاق کا شباب
نقشِ سجود میں مادہ تیرے سوز و ساز ہے
فرشِ حرم کو جس کی تجلی پہ ناز ہے
اے نورِ سرمدی سے درخشاں ترا چراغ
مہکے ہوئے ہیں، تیرے نفس سے دلوں کے باغ
حاصل ہے ماسوا سے تجھے کس قدر فراغ
تو معرفت کا دل ہے تو حکمت کا ہے دماغ

تیرے حضور دفترِ قدرت لیے ہوئے
قدسی کھڑے ہیں، شمعِ امامت لیے ہوئے

آئینِ رزم و بزم کی ہے تجھ سے آبرو
ہر بات برمحل ہے، مناسب ہر ایک خو
سختی کہیں رجز کی، کہیں نرم گفتگو!
برسا رہا ہے پھول کہیں، اور کہیں لہو

لوحِ ادب پہ کلکِ نسیمِ بہار ہے
میداں میں جھلکتی ہوئی ذوالفقار ہے

اے تیری شان، قلعۂ خیبر سے آشکار
ہجرت کی شب رسولؐ کے بستر سے آشکار
خونِ گلوئے مرحب و عنتر سے آشکار!
گردن پہ جبرئیل کے شہپر سے آشکار!

چرچا یہاں بھی، تیغ کا تیری، وہاں بھی ہے
رطب اللساں زمیں ہی نہیں آسماں بھی ہے

اے مرتضیٰ! امامِ زماں، شیرِ کردگار!
عرفاں کی سلطنت میں نہیں تجھ سا تاجدار
تیری ادائے حرب کا اللہ رے وقار
اک ضرب ہے عبادتِ ثقلین ہو نثار

تو خندہ زن ہے فتنۂ بدر و حنین پر
پیغمبری کو ناز ہے تیرے حسین پر

اے تیری فکر، روحِ دو عالم سے ہم کلام
اے تیری ذات، قوتِ پیغمبرِ انام
اے فلسفیٔ پاک دل، اے اولیں امام
تیرے قدم کا دوشِ نبوت پہ ہے مقام
اُڑتا ہے تجھ کو دیکھ کے رنگ آفتاب کا!
روشن ہے تجھ سے طورِ رسالت مآب کا!

خطروں سے ہو سکا نہ کبھی دل میں تو ملول
کانٹوں کو تیرے عزم نے سمجھا ہمیشہ پھول
ہجرت کی شب، ملا جو تجھے بسترِ رسولؐ
کیا نفس مطمئن تھا کہ ہنس کر کیا قبول
ایمائے ایزدی کی ادا بھا گئی تجھے
پُرہول خواب گاہ میں نیند آگئی تجھے

اے جوشؔ: دیکھ سیرتِ مولائے شیخ و شاب
ہر فعل بے نظیر ہے، ہر قول لاجواب
ہاں جنبشِ نظر سے ہے گردش میں آفتاب
سن گوشِ حق نیوش سے اک قولِ بوتراب
یہ قول ہے کلیدِ درِ کائنات کی!
یعنی اجل ہے خود ہی محافظ حیات کی

دنیا کنیز اس کی ہے، سمجھا یہ جس نے راز
کس نیند میں ہے امت شاہنشہ حجاز؟
ٹھنڈی پڑی ہے روح میں کیوں آتش گداز
کیوں مضمحل ہے دل میں شجاعت کا سوز و ساز
جب مرگ زندگی کی حفاظت کا نام ہے
اے اہل دہر! موت سے ڈرنا حرام ہے

سلام

کر چکا سیر، اصل مرکز پر اب آنا چاہیئے
اس زمیں پر اک نئی بستی بسانا چاہیئے
پڑ چکے ہیں سینکڑوں روحِ شہادت پہ حجاب
مومنو! اب ان حجابوں کو اٹھانا چاہیئے
استعاروں میں بیاں کرنے کے دن باقی نہیں
داستاں، اب صاف لفظوں میں سنانا چاہیئے
اب جھجک اچھی نہیں، اے سوگوارانِ حسینؑ
باندھ کر سر سے کفن، میداں میں آنا چاہیئے
آنچ جب آنے لگے حق پر تو بہر زندگی
موت کو بڑھ کر کلیجے سے لگانا چاہیئے

تیغ کے دامن کی جب آنے لگے رن سے ہوا
مرد کو انگڑائی لے کر مسکرانا چاہیئے

غور سے سن، غور سے، اے نازبردارِ حیات
مرد کو جینے کے دھوکے میں نہ آنا چاہیئے

تیری پابوسی کو خم ہے کب سے پشتِ آسماں
اے خاک! خاک سے اب سر اٹھانا چاہیئے

یوں ابھرنے سے رہا نقشِ حیاتِ جاوداں
زندگی پر خون کی مہریں لگانا چاہیئے

آفریں، اے ہمتِ مردانۂ ابنِ رسول!
صاحبِ غیرت کو یوں نہیں موت آنا چاہیئے

خیر، سطحِ مردمی تک تو گوارا ہے زوال
اس سے نیچے مردِ مومن کو نہ جانا چاہیئے

بسترِ احمد، شبِ ہجرت، یہ دیتا ہے صدا
اے علی! مردوں کو یونہی نیند آنا چاہیئے

کچھ سنا کیا کہہ رہا ہے جوشؔ: اکبر کا شباب؟
سینہ میں تیروں کے جوانی کو نہانا چاہیئے

شمعِ ہدایت

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزمِ کافری
رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بتانِ آذری!
عشقِ عرب کی امنگ سے، لہرا اٹھی نیاز کی
قلزمِ نازِ حسن میں، اف رے ترنگ آشناوری
اے کہ ترا غبارِ راہ، تابشِ روئے ماہتاب
اے کہ ترا نشانِ پا، نازشِ مہرِ خاوری
اے کہ ترے بیان میں، نغمۂ صلح و آشتی
اے کہ ترے سکوت میں، خندۂ بندہ پروری
اے کہ ترے فراغ پر جنبشِ پرتوِ صفا
اے کہ ترے ضمیر میں کاوشِ نور گستری
چھین لیں تو نے مجلسِ شرک و خودی سے گرمیاں
ڈال دی تو نے پیکرِ لات و ہبل میں تھرتھری
تیرے قدم پہ جبہ سا روم و عجم کی نخوتیں!
تیرے حضور سجدہ ریز چین و عرب کی خودسری
تیرے کرم نے ڈال دی، طرحِ خلوص و بندگی
تیرے غضب نے بند کی، رسمِ درہ ستمگری

ترے سخن سے دب گئے لاف و گزافِ کفر کے
ترے نفس سے بجھ گئی آتشِ سحرِ سامری!
لحن سے تیرے منتظم پست و بلندِ کائنات
ساز سے تیرے منضبط گردشِ چرخِ چنبری
جبینِ ستم سے بے خبر تیری جبینِ دل کشی
حرفِ وفا سے تابناک تیری بیاضِ دلبری
تیری پیغمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے
بخشا گدا سے راہ کو تو نے شکوہِ قیصری
بھٹکے ہوؤں پہ کی نظر مار شکِ خضر بنا دیا
راہزنوں کو دی ندا بن گئے شمعِ رہبری
سلجھا ہوا تھا کس قدر تیرا دماغِ حق رسی!
گھلا ہوا تھا کس قدر تیرا دلِ پیمبری
چشمہ ترے بیان کا غارِ حرا کی خامشی
نغمہ ترے سکوت کا نعرۂ فتحِ خیبری
زمزمہ ترے ساز کا لحنِ بلالؓ حق نوا
صاعقہ ترے ابر کا لرزشِ روحِ بوذریؓ
آئینہ ترے خلق کا طبعِ حسنؓ کی سادگی
جذبہ ترے عروج کا آلِ عبا کی برتری
جھلکیاں ترے ناز کی جنبشِ کاکلِ حسینؓ
رنگ ترے نیاز کا گردشِ چشمِ جعفریؑ

نشان تیرے ثبات کی عزمِ شہیدِ کربلا!
شرح تیرے جلال کی ضربتِ دستِ حیدری

رنگ ترے شباب کا جلوۂ اکبرِ خلیل!
نقش ترے شکیب کا خونِ گلوئے اصغری

تیرا لباسِ فاخرہ چادرِ کہنۂ بتول!
تیری غذائے خوش مزا نانِ شعیرِ حیدری

تجھ پہ نثار جان و دل، مڑ کے ذرا یہ دیکھ لے
دیکھ رہی ہے کس طرح ہم کو نگاہ کافری

تیرے گدائے بے نوا، تیرے حضور آئے ہیں
چہروں پہ رنگِ خستگی سینوں میں دردِ بے پری

آج ہدف ہے زہر سے ان کے سروں پہ ناوکے
رکھی تھی جن کے فرق پر تو نے کلاہِ سروری

تیرے فقیر اور دیں کوچۂ کفر میں صدا
تیرے غلام اور کریں اہلِ جفا کی چاکری

طرفِ کلہ میں جن کے تھے لعل و گہر ٹنکے ہوئے
حیف اب ان سروں میں ہے دردِ شکستہ خاطری

جتنی بلندیاں تھیں سب ہم سے فلک نے چھین لیں
اب نہ وہ تیغِ غزنوی، اب وہ نہ تاجِ اکبری

اُٹھ کہ ترے دیار میں پرچمِ کفر کھل گیا
دیر نہ کر کہ پڑ گئی صحنِ حرم میں ابتری

خیزو دلِ شکستہ را دولت سوز و ساز دہ
مسلمِ خستہ حال را رخصتِ ترکتاز دہ

آفتاب سے خطاب

آفتاب اے نو عروسِ صبح کے آئینہ دار
اے کہ تیرے قبضے میں تیرے سررشتہ لیل و نہار
اے کہ تیری ہر نظر اطرافِ عالم سے دوچار
اے کہ تیرے ساز پر ہستی کے نغموں کا مدار
ذرے ذرے کو تجلی کا پتا دیتا ہے تو
پتھروں کو چوم کر ہیرا بنا دیتا ہے تو
دور سے آتا ہے تو ہم کو جگانے کے لیے
نامِ غفلت کا زمانے سے مٹانے کے لیے
گدگداتا ہے شگوفوں کو ہنسانے کے لیے
خاک سے شبنم کے قطروں کو اٹھانے کیلیے
دیکھ کر پھولوں کی ناداری تڑپ جاتا ہے تو!
رنگ بن کر عارضِ گلشن میں کھپ جاتا ہے تو

اے کہ تو ہے جملہ موجوداتِ عالم کی مراد
بات میں تیری شعاعوں کے ہے نبضِ ابر و باد
دشمنانِ زندگی سے تو ہے مصروفِ جہاد
تیری کرنیں ہیں عناصر میں نظامِ اتحاد
حسنِ لیلائے جہاں پروردہ تیری محفل میں ہے
تیرے دم سے ولولہ نشو و نما کے دل میں ہے

وجد کرتی ہے زمیں، تیری ادائے ناز پر
بحر سر دھنتے ہیں تیرے شعلۂ آواز پر
ثابت و سیار مفتوں ہیں ترے انداز پر
رقص کرتا ہے نظامِ دہر تیرے ساز پر
سوز، بیداری عالم کا تری تانوں میں ہے
زمزمہ روئیدگی کا تیرے افسانوں میں ہے

ہاں دیئے جا تال یونہی، مطربِ بزمِ حیات
وجد میں دن ہے ترے نغموں سے اور غش میں ہے رات
مایۂ صد فخر ہے فانی جہاں کو تیری ذات
سرخرو رہ تا قیامت اے غرورِ کائنات
گرم تیرے جام سے ہستی کا میخانہ رہے
رہتی دنیا تک ترا گردش میں پیمانہ رہے

چھیڑ کچھ باتیں ہمارے نامور اجداد کی؛
تو تو ہے چھانے ہوئے گلیاں جہاں آباد کی
کچھ تو کیفیت بیاں کر ملت برباد کی
تیری نظروں میں تو ہونگی رونقیں بغداد کی
کتنے سکے تو نے دیکھے ہیں ہمارے نام کے؛
اے مورخ سطوت پارینۂ اسلام کے

اپنے نقش پا میں تھی شان کلاہ قیصری!
خانہ زادوں میں تھی اپنے صولت اسکندری
اپنی آنکھوں سے برستا تھا جلال حیدری
ٹھوکروں کی زد پہ رہتا تھا مذاق آذری
دنگ تھا ہر زمزمہ بانگ اذاں کے سامنے
کوہ جھک جاتے تھے اپنے کارواں کے سامنے

یاد تو ہونگے تجھے وہ دن بھی اے گردون حشم
اہل حق جس دور میں تھے صاحب تاج و علم
سادگی پر کس قدر مفتوں تھے خدام حرم
لقمۂ نان جویں تھا خوان ارباب کرم
چتر شاہی تھے سروں پر دلق زیب دوش تھے
آہ جب فقر و امارت دونوں ہم آغوش تھے

آفتاب: اے نیلگوں دریا کے رخشندہ گہر
اے کہ اڑ جاتا ہے تجھ سے خوابِ غفلت کا اثر
سچ بتا، پھر بھی کبھی آئے گی کیا ایسی سحر
جگمگاتا ہو گا تاجِ زر جب اپنے فرق پر
آنکھ کھل جائے گی غفلت سے جہاں آباد کی؛
جاگ اٹھے گی سلطنت غرناطہ و بغداد کی؛

مسلمِ خوابیدہ اب بیدار بھی ہو گا کبھی؛
کھا رہا ہے ٹھوکریں، خوددار بھی ہو گا کبھی؟
بزدلی کے نام سے بیزار بھی ہو گا کبھی؛
جان دینے کے لئے طیار بھی ہو گا کبھی؛
طور سے کیا پھر صدائے لن ترانی آئے گی؟
سچ بتا کیا پھر زلیخا پر جوانی آئے گی؛

مرحبا اے آفتابِ روح پرور مرحبا!
کیا دیا تو نے جواب امید میں ڈوبا ہوا
تو نے پھر سے مردہ ارمانوں کو زندہ کر دیا
تیرے قرباں، پھر تو دہرا دے یہ تو نے کیا کہا
چھٹ رہی ہیں ظلمتیں شب کی سحر ہونے کو ہے
آفتابِ تاجِ مسلم جلوہ گر ہونے کو ہے۔

مژدہ اے مسلم! کہ تو ہر رنگ میں پائندہ ہے
زندگی کے گو نہیں آثار، پھر بھی زندہ ہے

اک تبسم سا لبِ تقدیر پر رخشندہ ہے
ایک چنگاری ضمیرِ حق میں پھر تابندہ ہے

زندگانی کی سحر تربت ہوا آنے کو ہے
چرخ سے پھر "قُم باذنی" کی صدا آنیکو ہے

تجھ کو کیا پروا، ہوائے دہر اگر ناساز ہے
تجھ کو اوجِ لامکاں تک رخصتِ پرواز ہے

اُٹھ، کہ سینے میں ترے ارض و سماں کا راز ہے
بر لبِ جبریل سی تو آخری آواز ہے

ہو چکا ہے ختم تجھ پر سلسلہ الہام کا
فقرۂ آخر ہے تو اللہ کے پیغام کا

سبزۂ خوابیدہ وہ انگڑائیاں لے کر اٹھا
صبح ہونے کو ہے، تہ کر غفلتیں، بستر اٹھا

بحر ہے بے چین، کشتی ڈال دے لنگر اٹھا
تاجِ شاہی منتظر ہے، اے مسلماں سر اٹھا

دیکھ رحمت کی گھٹائیں ماہیِ بے آب ہیں
تیری کھیتی پر برسنے کے لئے بے تاب ہیں

فتح سمرنا

اے قوم! مبارک ہو کہ ساحل نظر آیا
غربت میں چراغِ سرِ منزل نظر آیا
گردوں پہ جمالِ مہِ کامل نظر آیا
محفل میں کوئی رونقِ محفل نظر آیا

یہ دن بھی بڑے فخر مباہات کا دن ہے
معشوق سے عاشق کی ملاقات کا دن ہے

اعجاز ہے اسلام کی جادو نظری کا!
زائل ہے اثر روح سے بے بال و پری کا
صد شکر کہ وہ دور گیا بے خبری کا
بیدار ہے پھر عزم جوانانِ جری کا

شب ختم ہوئی انجمن آرا نکل آیا
وہ صبح کا گردوں پہ ستارا نکل آیا

دشوار تھا بگڑی ہوئی زلفوں کا سنورنا
کچھ کھیل نہ تھا راہِ صعوبت سے گزرنا
اعجاز ہے ڈوبی ہوئی زلفوں کا ابھرنا
اسلام مبارک ہو تجھے فتح سمرنا!

جب تک کہ طلسمِ سحر و شام رہے گا
واللہ زمانے میں ترا نام رہے گا!

احرار نے کیا فوجِ سیاہ کار کو روکا
شیرانہ بڑھے، لشکرِ کفار کو روکا
اسلام کی گرتی ہوئی دیوار کو روکا
کس شان سے تلوار پہ تلوار کو روکا!

ہنگامِ دعا ہو تو دمِ سرد ہوں ایسے!
جب جنگ ہو ایسی تو جواں مرد ہوں ایسے

ہاں، یونہیں ترقی پہ رہے ہمتِ عالی
ہر خطۂ اسلام ہو اغیار سے خالی
تکمیل کرے قوتِ بازوئے کمال[1]
دشمن پہ چمکتی رہے شمشیرِ ہلال
کھل جائے کہ اس زر میں کوئی میل نہیں ہے
اسلام ہے اسلام، ہنسی کھیل نہیں ہے

---

[1] کمال پاشا

رحلتِ محمد علیؒ

اے متاعِ بردۂ ہندوستان و ایشیا!
اے کہ تھا ناخن پہ تیرے عقدۂ حق کا مدار
غش تھا کاوش پر تری اندازۂ صبح و مسا
خم تھی قدموں پر ترے بیرنگیٔ لیل و نہار
اے عزیزِ ملک و ملت؛ تو وہاں پہنچا تھا سالمش
موت جس منزل پہ بنتی ہے حیاتِ پائیدار
وقت کے سیلاب سے تیرا سفینہ ہے بلند
سیرتِ پیغمبرِ اسلام کے آئینہ دار!
تجھ کو بخشی تھی مشیت نے اک ایسی زندگی
جس بہادر زندگی کو موت پر آتا ہے پیار
تیرے آگے سرزہ بر اندام تھی روحِ فرنگ
اے دلِ ہندوستاں کے عزمِ تند و استوار
طنطنے سے تیری ہیبت آفریں آواز کے
تھی حسین ابن علی کی استقامت آشکار
ڈوب جاتی تھی دلِ باطل میں لہراتی ہوئی
تیرے لہجے میں لچکتی تھی وہ تیغِ آبدار!

؂ مولانا محمد علی مرحوم

موڑ کر رکھ دی تھی تو نے جنگ کے میدان میں
اہل بدعت کی کلائی، خنجر باطل کی دھار

تجھ پہ آتا تھا پسینہ افسر و اورنگ کو
اے کہ ہمت تھی تری قوت شکنِ سلطان شکار

خون میں تیرے نہاں تھی جنبشِ تیغ علیؓ
خاک میں تیری ودیعت تھا مزاج ذوالفقار

تیری سیرت میں تھی مضمر صولت پیغمبریؐ
تیری فطرت میں تھی پنہاں سطوت پروردگار

قوم کو بخشتا ہے تیری موت نے وہ بانکپن
کج ہوئی جاتی ہے ماتھے پر کلاہ افتخار

شاہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ[1]

اے شہنشاہِ ہمایوں کی مقدس خواب گاہ
دیکھتی ہے تجھ میں اک دنیائے غم میری نگاہ

آنسوؤں سے تیرے سقف و بام دھونیکے لئے
تجھ میں آیا تھا کوئی پوشیدہ ہونیکے لئے

---

۱ دہلی کے آخری تاجدار کی گرفتاری یہیں عمل میں آئی تھی۔

جھلملائی تھی تری محراب میں قندیل شاہ
موت کے دامن میں لی تھی زندگانی نے پناہ

اِس طرف اغیار کی فوجیں قطار اندر قطار
اُس طرف گنبد میں اک بیمار بوڑھا تاجدار

بار اِدھر فرقِ جہانبانی پہ تاجِ سروری
جُست اُدھر ٹھوکر لگانے کے لیے "سوداگری"

آسماں تھا زلزلے میں، اور تلاطم میں زمیں
اس کے آگے کیا ہوا؟ مجھ سے کہا جاتا نہیں

اس ترے گنبد کے نیچے اے جہانِ اضطراب
ایسی دو قبریں ہیں، دنیا میں نہیں جنکا جواب

اک مزارِ کج کلہ، اک کج کلاہی کا مزار
شاہ کی تربت کے پہلو میں ہے شاہی کا مزار

اُف بھرے آتے ہیں آنسو دیدۂ غمناک میں
دفن ہے تاتاریوں کا تاج تیری خاک میں

متولیانِ وقف حسین آباد سے خطاب

لکھنؤ میں وقف حسین آباد ایک شاہی وقف ہے جس کے عہدہ دار متولی حسین آباد اور آصف الدولہ بہادر کے مقبروں میں محرم کی آٹھویں اور نویں کو بہت بڑے پیمانے پر چراغاں کا اہتمام کرتے ہیں محرم اور چراغاں!! آٹھویں کے چراغاں کی یہ ایک شرمناک و غلامانہ خصوصیت ہے کہ اس شب کا کھیل تماشا، صرف "صاحب لوگوں" کے لئے مخصوص ہوتا ہے جو اپنے محبوبوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ادھر سے اُدھر قہقہے مارتے پھرتے ہیں اس دن کسی ہندوستانی کو امام باڑوں میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے صرف بعض ممتاز ہندوستانیوں کو پاسوں سے سرفراز کیا جاتا ہے البتہ صرف ہندوستانی اس شرط سے داخل ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے ہندوستانی لباس کو ترک کر کے انگریزی لباس میں آئیں

سن سکو تو چند نالے ہیں دلِ غمناک کے
اے گرامی ممبرو! وقفِ حسین آباد کے

مشعلوں کی جگمگاہٹ کی ہوا اُٹھتی ہے تماشا[1]
ہر محرم کی نویں اور آٹھویں تاریخ کو!

[1] نمائش۔

وہ اداس اور تشنہ دور اتیں سرِ جوئے فرات
جن کے سناٹے کے اندر گم تھی روحِ کائنات

جن کی رو میں درہم و برہم تھا دنیا کا نظام
جن کی خاموشی میں غلطاں تھا شہادت کا پیام

جن کی ہلچل سے تلاطم تھا دلِ آفاق پر
جھلملائی تھی وفا کی شمع جن کے طاق پر

جن کی ظلمت کو منور کر رہے تھے دل کے داغ
گل ہوا تھا جن کی آندھی میں مدینے کا چراغ

پُر فشاں تھے جن کے سناٹے پہ رس کیواسطے
تم نے ان راتوں کو چھانٹا ہے ہوس کیواسطے

مشغلوں میں جس جگہ خونِ شہیداں کا ہو رنگ
سیر کرنے کو بلائے جائیں واں اہلِ فرنگ !

کیا حمیّت ہے کہ اپنوں کے لئے ہو روک تھام
روپ میں بھی غیر کے آئے کوئی تو اذنِ عام

یہ تملّق، یہ خوشامد، یہ زبوں اندیشیاں
غم کدہ مسلم کا ہو نصرانیوں کا بوستاں

دیدہ ناہید ہو جس بزم میں افسانہ گو !
اس جگہ دی جائے دعوت چشمکِ مریخ کو !

داغ تھا سے دل میں کھولا جائے میخانے کا باب
قہقہے ہوں آنسوؤں کی انجمن میں بار یاب

بزمِ عصمت میں ، سر آنکھوں پر لیا جائے گناہ
مقبرے کو اور بنائے آسماں تفریح گاہ

دعوتِ حرف و حکایت ، زلزلے کی رات میں
منعقد ہو جشن ، اشکوں کی بھری برسات میں

بامِ شیون پر کھلے موجِ تبسّم کا عَلَم
خوں کے قطروں پہ اور اربابِ عشرت کے قدم

کشتیٔ صہبا چلے اہلِ وفا کے خون میں
آخری ہچکی بھری جائے گر مو فون میں

لشکرِ شادی سے روندی جائے غمخانے کی خاک
غازۂ خوباں بنائی جائے پروانے کی خاک

چنگ و بربط کا تسلط ہو دیارِ آہ میں
اہلِ ماتم لاش کو رکھیں نمائش گاہ میں

دیدِ عشرت اٹھے صد پارہ لاشہ دیکھنے
ہنسنے والے آئیں رونے کا تماشا دیکھنے

جوئے خون ، اور اس پہ تیراکی کا میلا ، الحذر
غیرتِ اسلام ! تجھ کو کھا گئی کس کی نظر ؟

روحِ مومن کو عطا ، یا رب خدا ! ادراک ہو
یہ نہیں تو صور پھنک جائے کہ قصّہ پاک ہو

آنسو اور تلوار

کربلا، گرم میداں، تمتماتا آفتاب
کشمکش، ہلچل، تلاطم، شور، غوغا، اضطراب

شورِ اسرافیل سے ملتا ہوا غوغائے جنگ
برچھیاں، نیزے، کٹاریں، تیر، تلواریں تفنگ

غازیوں کا طنطنہ، بانگِ رجز کا دبدبہ
طبل کی ڈول ڈول، رکابوں کے کڑکنے کی صدا

آگ کی لپٹیں، شعاعوں کی تپش، گرمی کا زور
اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ، لو کی رد قتل کا شور

جنگ جو میدان میں تیغِ دودم تولے ہوئے
اہلِ ہمت دھوپ میں کالے علم کھولے ہوئے

محفلِ باطل میں حق کی داستاں کہتا ہوا
سرخ ذروں پر جوانوں کا لہو بہتا ہوا

قلبِ اعدا پر حسینؑ ابنِ علیؑ کا رعب و داب
قطرۂ بے مایۂ شبنم پہ گویا آفتاب

رسم و راہِ حق سے ربط، آئینِ باطل سے عناد
عہدِ جانبازی، سرِ مردانگی، عزمِ جہاد
شوقِ آزادی، خیالِ سرفروشی، ذوقِ مرگ
یہ تھے انصارِ حسین ابنِ علی کے ساز و برگ
تم بھی ہو منجملۂ انصارِ شاہِ کربلا!
سچ کہو، ان میں سے تم کو کیا وراثت میں ملا
چند اشکوں کے لطائف، چند شیون کے نکات؟
کیوں ہی لے دیکے ہے یارو! تمہاری کائنات
اے عزیزو! اس بلا کی بے حسی کا کیا علاج
چند آہیں، اور وہ بھی بستۂ رسم و رواج
ہاں ازل سے ہے یہ تقسیمِ وراثت کا اصول
مرد کو دیتے ہیں شعلوں کی لپک عورت کو پھول
مرد کو ملتی ہے ترکے میں جھلکتی ذوالفقار
عورتوں کو شاخِ گل کا لوچ، شبنم کا نکھار
مرد کو ہوتا ہے حاصل غازیانہ قہقہہ
عورتوں کو ہچکیوں کی گونج، شیون کی صدا
اے کہ تم پوشاکِ حربی کے عوض پہنے ہو گون
دل میں خود سوچو، تم اس تقسیم سے ہوتے ہو کون؟

خیر اب تک جو بھی ہونا تھا عزیز و ہو چکا
لیکن اب حق اہلِ جرأت کو یہ دینا ہے صدا
جذبۂ مردانگی سے رد ٹھہ کر بنتا ہے کون ؟
حاملِ عزمِ شہیدِ کربلا بنتا ہے کون؟
ناؤ اپنی خون کے دریا میں کھینے کے لئے
کون بڑھتا ہے علیؑ کی تیغ لینے کے لئے
آج وہ ساونت آئے سامنے جس کا شباب
دے سکے شیبِ حبیب ابنِ مظاہر کا جواب
کون ہے تم میں سے عبدِ خاص ربِ مشرقین
کس کی نبضوں کو عطا ہو آتشِ خونِ حسین؟
کون خون اپنا بہا سکتا ہے پانی کی طرح ؟
کون مٹ سکتا ہے اکبر کی جوانی کی طرح ؟
کون سینے میں جلاتا ہے چراغ احساس کا
کون کاندھے پر اٹھاتا ہے علم عباس کا
آئے تقلیدِ حسینؑ ابن علی کرتا ہے کون
کامل آزادی سے جینے کے لئے مرتا ہے کون؟
کون میداں میں سنبھالے گا بصد شان و وقار
شورما عباس کا پرچم ، علی کی ذوالفقار

مومنو! حق کی تمہیں سوگند ایمان کی قسم
یہ صدا سن کر بڑھو کہتے ہوئے "حاضر ہیں ہم"
حکم دو تاریخ کو، دہرائے اپنی داستاں
یہ نہیں ہمت، تو ہاتھوں میں پہن لو چوڑیاں
مرد وہ کب ہے بھنور سے جو ابھر سکتا نہیں
حق ہی جینے کا نہیں اس کو جو مر سکتا نہیں

گریباں کو کیا ہوا

اے دل! جنونِ عشق کے ساماں کو کیا ہوا؟
ہوتا نہیں ہے چاک گریباں کو کیا ہوا؟
فکرِ سخن کا نور کہاں جا کے چھپ گیا؟
تخیل کے تبسمِ پنہاں کو کیا ہوا؟
رسمِ وفا کی کاہشِ پیہم کدھر گئی؟
ذوقِ نظر کی کاوشِ پنہاں کو کیا ہوا؟
گلشن میں زرد پھول کہاں جا کے بس گئے
کانیں ہیں سرد، لعلِ بدخشاں کو کیا ہوا؟
ہے خاکِ نجد برف میں گویا جلی ہوئی
اے قیسِ عامری! دلِ سوزاں کو کیا ہوا؟

چھائی ہوئی ہے چہرۂ ہستی پہ مردنی
الطافِ خضر و چشمۂ حیواں کو کیا ہوا؟

وہ جوہری رہے، نہ وہ گوہر نظر فریب
بازارِ مصر و یوسفِ کنعاں کو کیا ہوا؟

شاخوں میں وہ لچک ہے نہ غنچوں میں تازگی
طبعِ نسیم و فطرتِ نیساں کو کیا ہوا؟

اگلی سی وہ چمک نہیں اب آشیاں کے گرد
کنجِ قفس میں مرغِ پرافشاں کو کیا ہوا؟

کب سے ہیں بے نواؤں کے دستِ طلب دراز
اے روحِ فیض! ہمتِ سلطاں کو کیا ہوا

ہر اک صدف ہے آنکھ میں آنسو بھرے ہوئے
یارب! نزولِ قطرۂ نیساں کو کیا ہوا؟

آنکھیں ہیں بند، دید کی حسرت پہ کیا بنی
دل ہے خجل، تصورِ جاناں کو کیا ہوا

موجِ صبا میں اب نہیں انفاسِ عیسوی
گوہر فشانیٔ لبِ خوباں کو کیا ہوا؟

سوئی ہیں ایک عمر سے راتیں شباب کی
بزم آفرینیٔ مہِ تاباں کو کیا ہوا؟

ناخن سے اپنے چھیڑ رہا ہے کوئی نگار؟
اس پر بھی سن پڑی ہے رگِ جاں کو کیا ہوا!

کعبے میں بار پا گئے اصنام آذری
کاشانۂ خلیل کے دربان کو کیا ہوا
اب آستانِ کفر پہ ہیں سجدہ ریزیاں
اے کردگار مردِ مسلماں کو کیا ہوا؟
سینے میں اس گروہ کے کیوں اڑ رہی ہے خاک
درگنجِ حدیث و دولتِ قرآن کو کیا ہوا
قبضوں پہ ہاتھ ہیں، نہ جبینیں ہیں خاک پر
ذوقِ جہاد و جذبۂ عرفاں کو کیا ہوا
شانِ دعائے حمزہؓ و حیدرؓ کدھر گئی
روحِ دعائے بوذرؓ و سلمانؓ کو کیا ہوا؟
عزمِ حسینؓ ہے، نہ ثباتِ ابوترابؓ
صبرِ جمیل و ضبطِ فراواں کو کیا ہوا؟
ڈنکے بجا رہے ہیں شجاعت کے گوسفند
کوئی بتاؤ شیرِ نیستاں کو کیا ہوا؟
تن کر مقامِ صدر پہ بیٹھے ہیں زشت رُو
اے بزمِ نازِ خسروِ خوباں کو کیا ہوا؟
پھر ابرِ سامری سے برستے ہیں اژدہے
یارو! عصائے موسیٰؑ عمراںؑ کو کیا ہوا؟
آنکھیں دکھا رہے ہیں ستارے خدا کی شان
اے آسمان! مہرِ درخشاں کو کیا ہوا؟

اے جوشؔ! دیکھ منہ نہ گریباں میں ڈال کر
کیا پوچھتا ہے، مردِ مسلماں کو کیا ہوا!

سوگوارانِ حسینؓ سے خطاب

انقلابِ تند خو جس وقت اٹھائے گا نظر (۱)
کروٹیں لے گی زمیں، ہو گا فلک زیر و زبر
کانپ کر ہونٹوں پہ آ جائے گی روحِ بحر و بر
وقت کا پیرانہ سالی سے بھڑک اٹھے گا سر
موت کے سیلاب میں ہر خشک و تر بہ جائے گا
ہاں مگر نامِ حسین ابنِ علی رہ جائے گا

کون؟ جو ہستی کے دھوکے میں نہ آیا وہ حسینؓ
سر کٹا کر بھی نہ جس نے سر جھکایا وہ حسینؓ
جس نے مر کر عزتِ حق کو جلایا وہ حسینؓ
موت کا منہ دیکھ کر جو مسکرایا وہ حسینؓ
کانپتی ہے جس کی پیری کو جوانی دیکھ کر
ہنس دیا جو تیغِ قاتل کی روانی دیکھ کر

ہاں نگاہِ غور سے دیکھا اے گروہ مومنیں (۲)
جا رہا ہے کربلا خیرالبشر کا جانشیں
آسماں ہے لرزہ براندام جنبش میں زمیں
فرقِ پر ہے سایا افگن شہہ پر روح الامیں
اے شگوفو السلام ، اے خفتہ کلیو الوداع
اے مدینے کی نظر افروز گلیو الوداع
ہوشیار ، اے ساکت و خاموش کوفے ہوشیار (۳)
آرہے ہیں دیکھ رہ اعدا قطار اندر قطار ؟
ہونے والی ہے کشاکش درمیانِ نور و نار
اپنے وعدوں پر پہاڑ دل کیطرح رہ استوار
صبح قبضہ کر کے رہتی ہے اندھیری رات پر
جو بہادر ہیں ، اڑے رہتے ہیں اپنی بات پر
لُو کے جھکڑ چل رہے ہیں ، غیظ میں ہے آفتاب
سرخ ذروں کا سمندر کھا رہا ہے پیچ و تاب (۴)
تشنگی ، گرمی ، تلاطم ، آگ ، دہشت ، اضطراب
کیوں مسلمانو ! یہ منزل ، اور آلِ بوتراب
کس خطا پر تم نے بدلے ان سے گن گن کے لئے
فاطمہؓ نے اُن کو پالا تھا اسی دن کے لئے

لو وہ مقتل کا سماں ہے، وہ حریفوں کی قطار
بہ رہی ہے نہر، لو وہ سامنے بیگانہ وار! (۵)

وہ ہوا اسلام کا سرتاج مرکب پر سوار
دھوپ میں وہ برق سی چمکی، وہ نکلی ذوالفقار
آگئی رن میں اجل، تیغِ دو دم تولے ہوئے
جانبِ اعدا بڑھا دو زخ وہ منہ کھولے ہوئے

دور تک ہلنے لگی گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمیں
کوہ تھرّانے لگے، تیورا گئی فوجِ لعیں!
زد پر آکر کوئی بچ جائے، نہیں، ممکن نہیں
لو حسین ابن علی نے وہ چڑھا لی آستیں
آستیں چڑھتے ہی خونِ ہاشمی گرما گیا
الحذر! ہشیار، دریا میں تلاطم آگیا

ظہر کے ہنگام، کچھ جھکنے لگا جب آفتاب! (۶)
ذوقِ طاعت نے دلِ مولیٰ میں کھایا پیچ و تاب
آکے خیمے سے کسی نے دوڑ کر تھامی رکاب
ہو گئی بزمِ رسالت میں امامت باریاب
تشنہ لب ذرّوں پہ خوں مشکبو بہنے لگا
خاک پر اسلام کے دل کا لہو بہنے لگا

آفریں! چشم و چراغِ دودمانِ مصطفےٰ (۷)
آفریں صد آفریں و مرحبا صد مرحبا
مرتبہ انسان کا تو نے دوبالا کر دیا!
جان دے کر اہلِ دل کو تو سبق یہ دے گیا
کشتیٔ ایمان کو خونِ دل میں کھینا چاہیئے
حق پہ جب آنچ آئے تو یوں جان دینا چاہیئے

اے محیطِ کربلا! اے ارضِ بے آب و گیاہ
جرأتِ مردانۂ شبیرؑ کی رہنا گواہ! (۸)
حشر تک گونجیں گے تجھ میں نعرہ ہائے لا الٰہ
کج رہے گی فخر سے فرقِ رسالت پر کلاہ
یہ شہادت اک سبق ہے حق پرستی کے لئے
اک ستونِ روشنی ہے بحرِ ہستی کے لئے

تم سے کچھ کہنا ہے اب اے سوگوارانِ حسین
یاد بھی ہے تم کو تعلیمِ امامِ مشرقین؟ (۹)
تا کجا بھولے رہو گے غزوۂ بدر و حنین؟
کب تلک آخر ذاکروں کے ماجرا شور و شین؟
ذاکروں نے موت کے سانچے میں دل ڈھالے نہیں
یہ شہیدِ کربلا کے چاہنے والے نہیں

کہہ چکا ہوں بار بار، اور اب بھی کہتا ہوں یہی
ہاں رنج شیون نہیں میرا پیام زندگی!
لیکن اتنی عرض ہے اے نواسرِ بزدلی
ابھی بغضوں میں رواں کو خونِ سرجوشِ علی
ابن کوثر! پہلے اپنی تلخ کامی کو تو دیکھ
اپنے ماتھے کی ذرا مُہرِ غلامی کو تو دیکھ
جس کو ذلت کا نہ ہو احساس وہ نامرد ہے
ننگِ پہلو ہے وہ دل جو بے نیازِ درد ہے
حق نہیں جینے کا اس کو جس کا چہرہ زرد ہے
خودکشی ہے فرض اس پر، خون جس کا سرد ہے
وقت بیداری نہ غالب ہو سکے جو نوم پر
لعنت ایسی خفتہ ملت پر، تف ایسی قوم پر
زندہ رہنا ہے تو میرِ کارواں بن کر رہو
اس زمیں کی پستیوں میں آسماں بنکر رہو
دورِ حق ہو تو نسیمِ بوستاں بن کر رہو
عہدِ باطل ہو تو تیغِ بے اماں بن کر رہو
دوستوں کے پاس آؤ نور پھیلاتے ہوئے
دشمنوں کی صف سے گزرو آگ برساتے ہوئے

دورِ محکومی میں راحت کفر، عشرت ہے حرام
مہ وشوں کی چاہ، ساقی کی محبت ہے حرام
علم ناجائز ہے، دستارِ فضیلت ہے حرام
انتہا یہ ہے غلاموں کی عبادت ہے حرام
کوئے ذلت میں ٹھہرنا کیا گزرنا بھی حرام
صرف جینا ہی نہیں، اس طرح مرنا بھی حرام

کافرِ نعمت مسلماں

(یہ نظم حیدرآباد کی ایک محفلِ میلاد کے واسطے قلم برداشتہ لکھی گئی تھی)

تم نہ بگڑو، تو میں پوچھوں ڈرتے ڈرتے ایک بات
سچ بتاؤ کون ہے اس وقت ننگِ کائنات!

ہٹ گیا ہے کون ابرِ زندگی کی چھاؤں سے
کس نے اپنا تاج روندا ہے خود اپنے پاؤں سے

اس زمین و آسماں کی شہریاری چھوڑ کر
کون بھاگا ہے غلامی کی طرف منہ موڑ کر!

صاف کہنا کون ہے، ان ذیل کے عیبوں میں طاق
کذب، غیبت، افترا، اسراف، بدبینی، نفاق

آج کترانا ہوا وحدانیت کی راہ سے
یہ مرادیں مانگتا ہے کون غیر اللہ سے
جھومتا ہے کون قوالوں کے ہر اک بول پر
کون یہ عرسوں میں پیروں ناچتا ہے ڈھول پر
بن کے ذاکر، سیم و زر کے ڈھیر پہ گرتا ہے کون؟
خونِ اولادِ پیمبر بیچتا پھرتا ہے کون!؟
پشت پر کر چھوڑ کر آنکھوں پہ ہے کس کا مدار
جنگ کے میدان میں کس نے پھینک دی ہے ذوالفقار
جذبۂ عشرت میں کی ہے یوں خدا کی کس نے یاد؟
عسرتی کی کشمکش سے کر نہیں سکتا جہاد
کون جیلوں کی مشقت سے ہے یوں نالہ بحزیں
ضعف کی شدت سے جو تلوار اٹھا سکتا نہیں
گر گیا ہے آسماں سے کس کا پرچم خاک پر
جم گئی ہے برف کس کے شعلۂ چالاک پر
بن چکا ہے کس کا خود اپنی رشکِ حباب
مل چکا ہے کس کے انگاروں کو شبنم کا خطاب
کون ہیں یہ لوگ؟ کچھ سمجھے بھی اے اطفالِ دیں
مجھ کو تو یہ وہم ہوتا ہے کہیں تم تو نہیں؟
تم نہیں تو پھر یہ جینے کے عوض مرتا ہے کون
رو برو شمس آیات حق سے دل لگی کرتا ہے کون

جب یہ عالم ہے تو وابستہ ہو اصنام سے
تم کو پھر کیا واسطہ پیغمبرِ اسلام سے

حق کے دشمن، نفس کے پابند باطل کے غلام
تم کو کیا حق ہے کہ تم میلاد سے ہو شادکام

تشنگی سے کام کیا افسردگانِ خام کو
تم نے ٹھکرا دیا ہے حق کے آخری پیغام کو

کب تلوّن کو پتہ چلتا ہے استقلال کا
زاغ کو حق ہی نہیں بلبل کے استقبال کا

دل سے دم بھر کے لئے للہ سوچو تو ذرا
حق نے تم سے کیا کہا؟ اور تم نے حق سے کیا کہا

حق نے چھیڑا تھا رباب پر نغمۂ اُمّ الکتاب
تم نے برپا کر دیا ہنگامۂ چنگ و رباب

حق نے بخشا تھا تمہیں جوش و خروشِ جوئے آب
بن گئے ہو تم رفتہ رفتہ صرف اک نقشِ سراب

حق نے تم کو نوعِ انساں کا بنایا تھا امام
بن گئے تم لعنتِ کوتاہ بینی سے غلام!

حق نے چاہا تھا تمہیں دنیا کی شاہی کے لئے
تم سمجھ کر خود ہم بدلیں تباہی کے لئے

مومن، "مسلم" کا بخشا تھا تمہیں اس نے خطاب
شیعہ، "سنی"، کا نازل کر لیا تم نے عذاب

اس نے رکھا تھا ہتھیلی پہ تمہاری آفتاب
تم نے پنہاں کر دیا اس کو سحاب اندر سحاب

بندگی اصنام کی ٹھہرائی تھی اس نے حرام
اور تم ہر مقبرے کو جھک کے کرتے ہو سلام

دل میں شرماؤ ذرا یہ کیا غضب کرتے ہو تم
زندگی کا زہر مردوں سے طلب کرتے ہو تم

مجھ سے آنکھیں تو ملاؤ، تو اسیرانِ نفاق
اس مہینے کو سمجھ رکھا ہے تم نے کیا مذاق

یہ تو ہے اے ناشناسانِ عیارِ کفر و دیں
روحِ انسانی کی آزادی کا یومِ اولیں!

ہاں اسی دن کام لے کر قوتِ ادراک سے
اک انوکھی بات قدرت نے کہی تھی خاک سے

ہاں اسی دن ہو گیا تھا سنگِ حق سے چور چور
آبگینے کی طرح جھوٹے خداؤں کا غرور

ہاں اسی دن قلبِ انسانی کی جانب دور سے
سر ہوا تھا تیرِ ناوک کمانِ نور سے

ہاں اسی دن حق نے بہرِ نعتِ نوعِ بشر
مُہرِ آخر ثبت کی تھی سرمدی منشور پر!

ہاں یہ وہ دن ہے کہ درسِ حریت دیتی ہوئی
چونک اٹھی تھی زندگی، انگڑائیاں لیتی ہوئی

ہاں اسی دن نطقِ یزداں نے کیا تھا یوں کلام
آج سے منسوخ ہے قانونِ آقا و غلام!

ہاں اسی دن نے سنایا تھا یہ روحانی پیام
ابنِ آدم! ماسوی اللہ عبادت ہے حرام

ہاں نہ جھکے نوعِ انساں ماسوا کے سامنے!
اب جھکے بندہ تو صرف اپنے خدا کے سامنے

آج بھی کیا تم اسی قانون کے پابند ہو؟
چپ ہو کیوں؟ اپنے خداؤں کی بھی فہرست دو

مومنو! اسلام کی تائید کی تم کو قسم
بت پرستی چھوڑ دو، توحید کی تم کو قسم

صاحبِ قرآں ہو، تعلیمِ قرآں کی قسم
اہرمن سے توڑ دو ہر عہد، یزداں کی قسم

شاہِ بحر و بر ہو، تخلیقِ آدم کی قسم
اپنے دل کی قوتِ تسخیرِ عالم کی قسم

نازشِ ناموسِ کفن، شمشیرِ عریاں کی قسم!
موت کا دشمن مٹا دو، آبِ حیواں کی قسم

اس کرے کے آخری قالبوں کی تم کو قسم
جو تک اٹھو سپاہی کے خوں کی تم کو قسم

سرِ اٹھاؤ کشتگانِ عشق کے سر کی قسم!
رن میں آؤ قوتِ بازوئے حیدر کی قسم

نیند سے بیدار ہو، احساسِ کامل کی قسم
جاگ اٹھو پیغمبرِ اسلام کی تم کو قسم

ولادتِ رسول

(یہ نظم بھی حیدرآباد کی ایک محفلِ میلاد کیلئے نہایت عجلت میں عین وقت پر لکھی گئی تھی)

اے مسلمانو! مبارک ہو نویدِ صبحِ جاں فزا
لو وہ نازل ہو رہی ہے جبرئیلِ آسماں کا خطاب
دو نعشِ نامرادی کے ہاسِ گردوں سے حجاب
وہ سرِ سطح روشن سے ابھرا آفتاب

گم ضیائے صبح میں شب کا اندھیرا ہو گیا
وہ کلی چٹکی، کونپل پھوٹی، سویرا ہو گیا

زلف کا پیغام پھر بادِ صبا دینے لگی
پھر زبانِ گل صدائے مرحبا دینے لگی
شہپرِ جبریل کی جنبش ہوا دینے لگی
صبح لہرا کر چلی، شب راستہ دینے لگی

مہر کا زریں سفینہ آسماں کھینے لگا
چرخ پر دریائے نور انگڑائیاں لینے لگا

خسروِ خاور نے پہنچا دیں شعاعیں دُور دُور
دل کھلے، شاخیں ہلیں، شبنم اڑی چھایا سرور
آسماں روشن ہوا، کانپی زمیں پر موجِ نور
پو پھٹی دریا بہے، سنکی ہوا چہکے طیور

نورِ حق فاران کی چوٹی کو چمکانے لگا
دلبری سے پرچمِ اسلام لہرانے لگا

گرد بیٹھی کفر کی، اٹھی رسالت کی نگاہ
گر گئے طاقوں سے بت خم ہو گئی پشتِ گناہ
چرچ سے آنے لگی پیہم صدائے لا الٰہ*
ناز سے کج ہو گئی آدم کے ماتھے پر کلاہ

آتے ہی ساقی کے ساغر آ گیا، خم آ گیا
رحمتِ یزداں کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا

آگیا جس کا نہیں ہے کوئی ثانی، وہ رسولؐ
روحِ فطرت پر ہے جس کی حکمرانی، وہ رسولؐ
جس کا ہر تیور ہے حکمِ آسمانی وہ رسولؐ
موت کو جس نے بنایا زندگانی، وہ رسولؐ

محفلِ سفاکی و وحشت کو برہم کر دیا!
جس نے خوں آشام تلواروں کو مرہم کر دیا

فقر کو جس کے تھی حاصل کج کلاہی وہ رسولؐ
گلہ بانوں کو عطا کی جس نے شاہی، وہ رسولؐ
زندگی بھر جو رہا بن کر سپاہی، وہ رسولؐ
جس کی ہر اک سانس قانونِ الٰہی، وہ رسولؐ

جس نے قلبِ تیرگی سے نور پیدا کر دیا
جس کی جاں بخشی نے مردوں کو مسیحا کر دیا

واہ کیا کہنا ترا اے آخری پیغامبرؐ
حشر تک طالع رہے گی تیرے جلووں کی سحر
تو نے ثابت کر دیا اے ہادیٔ نوعِ بشرؐ
مرد یوں مہریں لگاتے ہیں جبینِ وقت پر

گردشیں دنیا کی تیرا قصر ڈھا سکتی نہیں!
آندھیاں تیرے چراغوں کو بجھا سکتی نہیں

تیری پنہاں قوتوں سے آج بھی دنیا ہے دنگ
کس طرح تو نے مٹایا امتیازِ نسل و رنگ
ڈال دی تو نے بنائے ارتباطِ جام و سنگ
بن گیا دنیا میں ہنگامِ اخوت، ذوقِ جنگ
تیرگی کو رو کشِ مہرِ درخشاں کر دیا!
تو نے جس کانٹے کو چمکایا گلستاں کر دیا

یہ مسرت کا محل ہے، اے عزیز بے کار!
تلخیٔ گفتار، اس موقع پہ ہوگی ناگوار
قہر ہے بزمِ طرب میں نالۂ جانِ فگار
لیکن اس کو کیا کروں دل پر نہیں ہے اختیار
آگ سی روشن ہے اک قلب و جگر کے سامنے
سے کہے دیتا ہوں جو کچھ ہے نظر کے سامنے
اس نئے انبوہ میں اے مسلمِ اندوہ گیں!
دیر سے موجود ہیں خود رحمۃ اللعالمیں
زیرِ لب فرما رہے ہیں وائے بر جانِ حزیں
کوئی بھی ان میں ہمیں پہچاننے والا نہیں
ذکر دیں ہونٹوں پہ ہے، دنیا کی گھاتیں دل میں ہیں
صبحیں چہروں پہ ہیں طالع، اور راتیں دل میں ہیں

اے میرے معبود! انہیں محسوس ہو سکتا یہ کاش
شدتِ درماندگی سے؛ کتنے دل ہیں پاش پاش
آہ کتنوں کو ہے اک روٹی کے ٹکڑے کی تلاش
کتنے معصوموں کے چہروں پر ہے اشکوں کی خراش

شمع کی حاجت نہیں ہے محفلوں کے واسطے
کچھ چراغوں کی ضرورت ہے دلوں کے واسطے

کاش میرے انہی قرآں کا دفتر دیکھتے
سیرتِ مقدادؓ و بوسلمانؓ و ابوذرؓ دیکھتے
قصۂ حسینؑ سنتے ضربِ حیدرؑ دیکھتے
کس طرح مرتے نہیں یہ بات مر کر دیکھتے

کاش ان کی عقل میں آتا یہ آسانی کے ساتھ
نعمتِ کونین کا رشتہ ہے قربانی کے ساتھ

علم سے نا آشنا محکوم، حاکم سرد و خام
روز و شب آویزشیں ہیں درمیان خاص و عام
ضابطہ جینے کا ہے ان میں، نہ مرنے کا نظام
حیف تیری چپقلش پر اے گروہِ بے امام

جادہ ہے پُرپیچ، منزل کا نشاں کوئی نہیں
کارواں ہے اور میرِ کارواں کوئی نہیں

سلام

طبع میں کیا تیغ براں میں روانی چاہیے
گل فشانی ہو چکی، اب خوں فشانی چاہیے

بستۂ زنجیر نجکو بی: خبر بھی ہے تجھے
ہر دمہ پر تجکو عزمِ حکمرانی چاہیے

ہر قدم شہزادہ اکبر سے آتی ہے صدا
حق پہ جو مٹ جائے ایسی نوجوانی چاہیے

شاہ فرماتے ہیں، بیٹا، ہے جو خدا کے نام پر
موت جسے کہتی ہے اکبر کی جوانی چاہیے

سن کے حسین کا نام بغض چھوٹ جائیں موت کی
دین کے ساونت کو نہ زندگانی چاہیے

عمرِ فانی سے تو برگِ کاہ تک ہے بہرہ مند
مرد کو ذوقِ حیاتِ جاودانی چاہیے

کون پڑھتا ہے لہو تھوڑا سا دینے کیلئے
اے عزیزو! دین کی کھیتی کو پانی چاہیے

جن کے سینوں میں ہو سوزِ تشنگانِ کربلا
ان جواں مردوں کی تلواروں میں پانی چاہیے

جوشش؛ ذکرِ جراحتِ ہو تی پہ شبوں کے عوض
رخ پہ شانِ فخر و نازِ کامرانی چاہیئے

آوازۂ حق

کیوں کر نہ کروں شکرِ خدائے دو جہاں کا
بخشا ہے مرے دل کو مزا سوزِ نہاں کا
یکساں ہے مسرت کا محل ہو کہ فغاں کا
ہو نارِ جہنم بھی تو لطف آئے جناں کا
ہوتی ہے خوشی صحت و آوازے مجھ کو
خلعت یہ ملا ہے تری سرکار سے مجھ کو
سینے میں چھپائے ہوں جو انوار کسی کے!
دل میں نہیں آتے ہیں خیالات دوئی کے
رونے کے ہوں اسباب، کہ سامان ہنسی کے
جو چیز ہے ڈھل جاتی ہے سانچے میں خوشی کے
یلدائے شبِ تار ہے یا جلوۂ سحر ہے
جس حال میں ہوں حسن مرے پیشِ نظر ہے

لہ یہ سلسلۂ اسلامیات کی غالباً سب سے پہلی نظم ہے جو شاید ۱۹۲۳ء کے آخر میں کہی گئی تھی جب ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہوا تھا اور مصنف کے نزدیک سیاسی مصلحت کی بنا پر "خلافت کو باقی رہنا چاہیئے تھا۔"

اغیار کی فوجیں ہوں کہ احباب کی محفل
گرمی کے بگولے ہوں، کہ لیلیٰ کی ہو محمل!

راہوں کی صعوبت ہو کہ خوابِ سرِ منزل
ہوتا ہے ہر اک چیز سے بشاش مرا دل

صد شکر مرے دل پہ حقیقت یہ عیاں ہے
ہر آئینے میں دوست کی تصویر نہاں ہے

ہر بات میں اک حسن ہے، ہر شے میں لطافت
بدشکل کوئی چیز نہیں، ہو جو بصارت

رونا بھی ہے اک راگ، جو کامل ہے سماعت
ہر اشک کے ساغر سے ابلتی ہے بشاشت

آنکھیں ہوں اگر، نار میں ہے نور کا جلوہ
ہر ذرۂ ناچیز میں ہے، طور کا جلوہ

ہو ریگ کا انبار کہ برسات کا دریا
وہ جیٹھ کی ہو دھوپ کہ بادل کا ہو پردا

وہ لو کے تھپیڑے ہوں کہ ہو لوچ صبا کا!
وہ خالِ سیہ ہو کہ چمکتا ہوا تارا!

اے حسن کے صانع، ترے اسرار نہاں ہیں
ہر شے میں کم و بیش کچھ انوار نہاں ہیں

شادی و الم اور رنج و خوشی، مدح و مذمت
آشفتگی و عیش و طرب، درد و مصیبت!
آشوب جہاں، شامِ بلا، صبحِ مسرت
سب ایک نظر آئیں، جو ہو روح میں قوت

ہم دل کا اگر ساز ستاروں سے ملا دیں
گو تار بہت سے ہیں، مگر ایک صدا دیں

نالے میں ہے، جو نغمۂ بلبل میں نہیں ہے
جو زلفِ پریشاں میں ہے، سنبل میں نہیں ہے
اکثر جو ہے اعجازِ کشش، گل میں نہیں ہے
کانٹے میں بھی اک شان ہے جو گل میں نہیں ہے

در پردہ یہ سب ایک ہیں ظاہر میں جدا ہیں
سب اپنے مقامات پہ تصویرِ خدا ہیں

پیشانیٔ تشویش میں ہے جلوۂ تمکین
تلخی میں بھی پوشیدہ ہیں کچھ جوہرِ شیریں
ہر درد کی ایذا میں ہے اک پہلوئے تسکیں
جو داغ ہے وہ دل کے لئے تاج ہے زریں

یہ دل جو دھڑکتا ہے تو اک قسم کی گت ہے
یہ زہر میں سنتے ہیں کہ تریاق کا ست ہے

جن کی یہ تمنا ہے کہ دائم رہیں مسرور
ہیں فلسفۂ لرزِ تمدن سے بہت دور

افراطِ خوشی غم ہے یہ فطرت کا ہے دستور
صدیوں ہیں رنج راحت و آرام ہے مستور

خود لطف کی ہے پردۂ آفات کے پیچھے
پنہاں ہے سپیدا سحر رات کے پیچھے

دب جاتے ہیں غم سے جو خیالات ہیں اسفل
ہو جاتے ہیں انسان کے اخلاق مکمل

غم نفس کا قاتل ہے تو باطن کی ہے صیقل
مرجاتا ہے جب سانپ نکل جانے ہیں بل

جی کھول کے رونا ہے علاج آنکھ کے نل کا
ہر آہ سے کچھ زہر نکل جاتا ہے دل کا

تکلیف کو تفریح بنا لینے کی صنعت
حاصل ہے انہیں جو ہیں پرستارِ حقیقت

آئینہ ہے اسرار کا ہر منظر قدرت
وہ چاند کی خنکی ہو کہ سورج کی حرارت

"مہمل ہیں یہ لفظیں یہ برا ہے وہ بھلا ہے"
جو کچھ ہے وہ صرف اک تبسم کی ضیا ہے

ہو دوست کے پہلو میں نشیمن تو مسرت
مل جائے اگر راہ میں دشمن تو مسرت
ہو زیرِ قدم سبزۂ گلشن تو مسرت
کانٹوں میں الجھ جائے جو دامن تو مسرت

تدبیر اگر وصل کی ہو، رقص کی جا ہے
اور ہجر کی شب ہو تو تڑپنے کا مزا ہے

دنیا خس و خاشاک ہے دامن کو ہٹا لے
نازک ہے بہت دل، غمِ ہستی سے بچا لے
اشکوں کے بخارات میں رہ دل کو سنبھالے
دانا ہے جو ہر غم میں خوشی ڈھونڈ نکالے

کب شیشۂ دل، گردِ کدورت کے لئے ہے
ہر رنج میں آرام، بہادر کے لئے ہے

پردے کو تعین کے درِ دل سے اٹھا دے
کثرت نہیں وحدت ہے یہ آنکھوں سے دکھا دے
ہاں بڑھ کے حجابِ رخِ جاناں نہ ہٹا دے
میدان کو حدیں توڑ کے ہموار بنا دے

چوٹی سے چلے کوہ کی خورشید کا جلوہ !!
ہستی کی رگ و پے میں ہو توحید کا جلوہ

جو سعی میں سرگرم ہے دو اس کے ہیں انجام
سرسبز ہو، یا شومیٔ قسمت سے ہو ناکام
سرسبز اگر ہو، تو مسرت کے چلیں جام
ناکام جو ہو تو بھی پئے بادۂ گل فام
یہ دونوں دوائیں ہیں جو یکساں ہیں اثر میں
جو یاس میں لذت ہے، وہی فتح و ظفر میں

اے دوست! بتاتا ہوں تجھے روح کے اسرار
صدموں سے اگرچہ ہے ترا دل بیمار
آنکھیں تو اٹھا، دیکھ ذرا حسن کے انوار
یہ چاند، یہ سورج، یہ نباتات، یہ کہسار
کیوں تیرے خیالات پریشاں ہیں برادر
اک غم ہے، تو سو عیش کے ساماں ہیں برادر

غنچوں کی حیا، گل کی ہنسی، اوس کے گوہر
زرتارِ شفق، سرد ہوا، باغ معطر
رنگین گھٹا، قوسِ قزح مہر منور
نغمے یہ پرندوں کے، پہاڑوں کے یہ منظر
ہے کون سی خوبی جو بہ توفیق نہیں ہے
کیا باغِ ارم ختم کے یہ تو میں نہیں ہے؟

یہ غم ہے، وہ راحت ہے، یہ عقبیٰ ہے یہ دنیا
ان تنگ خیالات کے سانچے سے نکل آ

ہر فکر سے منہ پھیر لے، ہر رنج کو ٹھکرا
اونچا ہو، بلندی پہ جھلک، روح کو چمکا

محفل میں تصوف کی تجھے بار ملے گا
ہر سانس میں اک مصر کا بازار ملے گا

اترے گی ترے دل میں ضیائے رخِ جاناں
کانٹوں میں بھی تجھ کو نظر آئیں گے گلستاں

آنکھیں ترے تلووں سے ملیں گے جن و انساں
جنت سے ہوا دے گا تجھے حور کا داماں

غل حشر میں ہوگا یہ ہے حیدر کا شرابی
آتا ہے وہ مے خانۂ کوثر کا شرابی

آزاد بھی ہو کشمکشِ سود و زیاں سے
ہاں دل کو بچا تیرگیٔ آہ و فغاں سے

لمحے جو گزرتے ہیں، پھر آئیں گے کہاں سے
باہر تو نکل وہم کے تاریک مکاں سے

پھیلی ہے جہاں رخِ جاناں کی تجلی
وہ دیکھ بلندی پہ ہے عرفاں کی تجلی

اس راہِ نجات میں آ، گر ہے جواں مرد
یہ راہ ہے جس میں نہیں اڑتی ہے کبھی گرد
چہرے کبھی اس راہ میں ہونے ہی نہیں زرد
پھولوں کی مہک آتی ہے، چلتی ہے ہوا سرد

دنیا ہے یہ وہ جس میں فلک ہے، نہ زمیں ہے
ذرے میں یہاں وہ ہے جو سو دشت میں نہیں ہے

طے ہوتی ہے یاں دل کے دھڑکنے سے مسافت
سائے کی نہ حاجت، نہ ساماں کی ضرورت
اس راہ میں آنکھیں بھی اٹھاؤ تو نحوست
اس بزم میں گر سانس بھی لیجئے تو کثافت

نسبت کچھ اسے عالمِ ظاہر سے نہیں ہے
کچھ بحث یہاں مومن و کافر سے نہیں ہے

کیا خوب ہیں اس انجمنِ خاص کے دستور
بے قدر ہے، جبتک کہ نہ ہو شیشۂ دل چور
آتا نہیں کچھ عقل میں، ہوتے ہیں وہ منظور
دوزخ میں وہی شے ہے، جو چمکی تھی سرِ طور

ذرے میں جو ہے مہرِ درخشاں میں وہی ہے
جو کفر کے سینے میں ہے، ایماں میں وہی ہے

اس بزم کے آداب ہیں سرچشمۂ حکمت
آرام سے وحشت ہے، تو لذّات سے نفرت
پھر جائے جو ہستی سے نظر، عین سعادت
دل پھیلے پھیر رات سے دھڑکے تو عبادت

ہر دن جو گزرتا ہے یہاں ایک صدی ہے
اس دائرے میں "موت" حیاتِ ابدی ہے

محنت میں نہیں جس کی یہاں نقص وہ بیمار
کاموں میں جو دنیا کے ہے مشغول وہ بیکار
آنے نہیں پاتے کبھی اس بزم میں زردار
زردار کے معنی ہیں کہ محتاج ہے نادار

دولت کی حقیقت کوئی سمجھی نہیں جاتی
منعم کی یہاں بات بھی پوچھی نہیں جاتی

اس راہ میں جو یاد کرے دوست کو، غافل
اس سے یہ کھلتا ہے ابھی دور ہے منزل
معشوق سے ہر وقت نہیں قرب سے حاصل
کس کو وہ کریں یاد یہ بتائے کوئی عاقل

دل آہ کبھی وصل میں بھرتا ہو تو کہہ دو
اپنے کو کوئی یاد جو کرتا ہو تو کہہ دو

جس کا یہ عقیدہ ہے، کہ میں عبدہٗ و معبود"
اس بزم کا قانون یہ کہتا ہے "وہ مردود"
سب ایک حقیقت میں ہیں، ساجد ہو کہ مسجود
ہے کفر یہ کہنا: "یہ ایاز اور وہ محمود"

یاں لفظِ "انا الحق" میں "انا" باعثِ شر ہے
اس سے ٹپکتا ہے خودی پیشِ نظر ہے
ہر دل کو یہاں کام ہے تسلیم و رضا سے
ہر لب کو یہاں عہد ہے تسبیحِ خدا سے

کیا اس سے سروکار ہے، بھوکے ہوں کہ پیاسے
بس ہنر بڑا یہ ہے کہ نفرت ہو دوا سے
دعوت ہیں یہاں بھوک ہے، خلعت ہیں کفن ہے
انعام یہاں سب سے بڑا دار و رسن ہے

اک روز ہوا شوق مرے دل میں یہ پیدا
اس راہ سے گزرے ہیں جو نام آور دیکھا
حالانکہ کبھی کچھ ان سے میں دیکھوں کہ وہ تھے کیا
اس شوق میں تاریخ کے اوراق کو الٹا

فہرست میں اک نام تھا جو سب سے جلی تھا
مژدہ ہو کہ وہ نام حسینؑ ابنِ علیؓ تھا۔

قربان ترے نام کے اے میرے بہادر
تو جانِ سیاست تھا، تو ایمانِ تدبر

معلوم تھا باطل کے مٹانے کا تجھے گر
کرتا ہے تری ذات پہ اسلام تفاخر

سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ صداقت کا سبق تھا
تلوار کے نیچے بھی وہی نعرۂ حق تھا

شعلے کو سیاہی سے ملایا نہیں تو نے
سر کفر کی چوکھٹ پہ جھکایا نہیں تو نے

وہ کون سا غم تھا جو اٹھایا نہیں تو نے
بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا نہیں تو نے

دامانِ وفا گھر کے شریروں میں نہ چھوڑا
جو راستہ سیدھا تھا وہ تیروں پہ نہ چھوڑا

ہر چند کہ ایوبؑ بھی اس فن میں تھے یکتا
یونسؑ نے بھی اک حد تک اسے خوب نبھایا

یعقوبؑ نے بھی زورِ تحمل کا دکھایا
پر سب سے رہا بڑھ کے محمد کا نواسا

غیرت میں پیمبر ہوئے، وہ کر کے دکھایا
مرتے ہیں کس طرح اِسے مر کے دکھایا

کرتا ہوں رقم معرکۂ کرب و بلا کا
طوفان تھا، سیلاب تھا اربابِ جفا کا
سینوں میں تلاطم ہو، وہ ساماں تھا دغا کا
بشاش مگر دل تھا امامِ دوسرا کا

ماتھے پہ شکن تھی، نہ بدن غرقِ عرق تھا
رخ پر وہ صباحت تھی کہ سمنے کا ورق تھا

فرمانے تھے سب قتل ہوئے شہر کے بانی
قاسم کہ تھا سمِ خوردہ برادر کی نشانی
اور حسن میں اکبر تھا مرا یوسفِ ثانی
عباس تھا اسلام کی بھرپور جوانی

سینے میں خلش، لب پہ مرے آہ نہیں ہے
ہرچند اب ان میں کوئی ہمراہ نہیں ہے

لشکر کی طرف دیکھ کے کہتے تھے یہ ہر بار
یہ طبل و علم ہیچ، یہ انبوہ ہے بیکار
انجام پہ کر غور ذرا، شمرِ بد اطوار
کس شے نے کیا ہے تجھے اس جور پہ طیار

فاسق کے لئے جنگ امامِ دوسرا سے
بندہ کہیں منہ پھیر کے چلتا ہے خدا سے؟

اسے شتر اکوئی چیز ہے، یہ فوج گنہگار
دنیا بھی اُمنڈ آئے تو پروا نہیں زنہار
مرعوب مجھے کر نہیں سکتے یہ سیہ کار
باطل سے کبھی دبتے ہیں کہیں حق کے طرفدار
نازاں ہے کہ سردار ہوں میں فوج ستم کا
سررشتہ مرے ہاتھ میں ہے لوح و قلم کا
اس باپ کا بیٹا ہوں جو تھا اشجع عالم
جس فرق پہ تھا سایہ فگن فتح کا پرچم
جس ذات سے اسلام کی بنیاد تھی محکم
تھا اصل میں جو قوت پیغمبر اکرم
طفلی میں بھی ساونت نے اژدر کو نہ چھوڑا
بے توڑے ہوئے قلعہ خیبر کو نہ چھوڑا
جس روز مدینے کو سدھارے تھے پیمبر
اس روز برادر کی جگہ پر تھا برادر
یہ جانتا کہ تیغوں کی چمک تھی سر بستر
سوتا تھا بڑے لطف سے تانے ہوئے چادر
دنیا میں کوئی ایسا جری ہو نہیں سکتا
جس طرح وہ سوئے تھے، کوئی سو نہیں سکتا

یوں سامنے آ آ کے اکڑنا نہیں اچھا
ایماں سے اس طرح بگڑنا نہیں اچھا
ناداں! بڑی بات پہ اڑنا نہیں اچھا
دنیا کے لئے دین سے لڑنا نہیں اچھا

ناپاک نہ بن دولتِ ناپاک کے بدلے
اکسیر کو ٹھکراتا ہے کیوں خاک کے بدلے

ثروت جو زیادہ ہو تو ایماں نہیں رہتا
انسان یہ وہ شے ہے کہ انساں نہیں رہتا
آسودگیِ روح کا ساماں نہیں رہتا
دل انجمنِ حسن کے شایاں نہیں رہتا

دولت کو بہت لوگ یہ کہتے ہیں خدا ہے
میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ زر ایک وبا ہے

ہوں خواہشیں محدود تو ایذا نہیں ہوتی
ارماں جو ہوں کم، زر کی تمنا نہیں ہوتی
قانع کو کسی چیز کی پروا نہیں ہوتی
مومن پہ مسلط کبھی دنیا نہیں ہوتی

سلطان بھی ہو جو صاحبِ حاجت تو گدا ہے
جس کو کوئی حاجت ہی نہیں ہے وہ خدا ہے

اے بندۂ زر! چونک، مناسب نہیں غفلت
معلوم نہیں کیا تجھے دنیا کی حقیقت؟

کس نیند میں ہے؟ چھوڑ بھی باطل کی محبت
آ حق کی طرف، دیکھ یہ حوریں ہیں یہ جنت

حوریں ہوں کہ فردوس، یہ ادنیٰ سا صلہ ہے
خود حق ہی وہ لذت ہے جو ان سب سے سوا ہے

دنیا ہے، دنی ہیچ ہے دنیا کا زر و مال
تذلیل کی بنیاد ہیں یہ حشمت و اجلال

آوارہ کوئی چیز ہے دراصل "اقبال"
وہ سر بھی کوئی سر ہے جو ہونے کو ہے پامال

بیدار ہیں دل جن کے وہ دنیا سے خفا ہیں
جو پھول کے طالب ہیں وہ کانٹوں سے جدا ہیں

تکلیف کے اسباب کو راحت نہیں کہتے
جو چند نفس ہو، اسے لذت نہیں کہتے

طوفانِ مصائب کو مسرت نہیں کہتے
جس شے کو فنا ہو، اسے نعمت نہیں کہتے

آرام کی خواہش نہ کر، دقوتِ زر سے
لبریز کر دروح کو اللہ کے ڈر سے

غدّار زمانے کی لگاوٹ سے خبردار
بیدار رہو، بیدار رہو، ہشیار رہو ہشیار

جھوٹی یہ امیدیں ہیں پریشاں ہیں افکار
کس نشے میں بدمست ہے دنیا کے طلبگار

یہ شاخ ہے وہ جو کبھی پھولی نہ پھلی ہے
دنیا تجھے ناداں کدھر لے کے چلی ہے

کھینچے لئے جاتا ہے کہاں تجھ کو زمانہ
سننے کے سزاوار نہیں ہے یہ فسانہ

دولت ہی کوئی اصل میں شے ہے نہ خزانہ
دھوکا ہے یہ دھوکا ہے، بہانہ ہے بہانہ

واللہ کہ تو حرص کے سانچے میں ڈھلا ہے
حق چھوڑ کے باطل کی پرستش کو چلا ہے

دنیا جسے کہتے ہیں کثافت کا ہے انبار!
خنزیر کی ہڈی سے بھی کچھ بڑھ کے ہے مردار

ناپاک ہے، بد اصل ہے، کم ظرف ہے بدکار
مردار شکم اس کا، تو پشت اس کی ہے بیمار

برص کے داغوں سے عفونت میں سوا ہے
ذلت کا یہ لقمہ ہے، سگوں کی یہ غذا ہے

تو مجھ سے کہتا ہے جیسے، وعیش وتنعم
وہ خواب کی جنت ہے، وہ فردوس توہم
نالے ہی کی رو داد ہیں، نغمہ کہ ترنم
ہے مہرِ فغاں روشنئ ماہِ تبسم

تو جس کو سمجھتا ہے کہ فردوس بریں ہے
دھندلی سی مسرت کا وہ سایہ بھی نہیں ہے

جا گورِ غریباں پہ نظر ڈال بہ عبرت
کھل جائے گی تجھ پر تری دنیا کی حقیقت
عبرت کے لئے ڈھونڈھ کسی شاہ کی تربت
اور پوچھ کدھر ہے وہ تری شانِ حکومت

کل تجھ میں بھرا تھا جو غرور آج کہاں ہے؟
اے کاسۂ سر بول ترا تاج کہاں ہے؟

یہ کہہ کے جو مولی نے نظر کی سوئے کفار
تھا سر کو جھکائے ہوئے ہر ایک سیہ کار
ہر شخص کے چہرے پہ خجالت کے تھے آثار
یہ رنگ جو دیکھا تو کہا شمر نے بیدار

ہشیار! امرائے طلب گار جوانو!
ہو جاؤ بس اب جنگ پہ تیار جوانو!

تقریر میں کامل ہیں بہت حضرت شبیر
ہو جاؤ گے گمراہ اگر ہو گئی تائید
کیا دیر ہے میداں میں بڑھو تو لکھے شمشیر
یہ زر ہے، یہ دولت ہے، یہ منصب ہے یہ جاگیر
ہو جاؤ گے بشاش وہ انعام ملے گا
کہتا ہوں کئی پشت تک آرام ملے گا

کفار کو یہ شمر نے لالچ جو دلائی
دنیا نے بصد ناز جھلک اپنی دکھائی
جھنکاریں تیغوں کی بڑے ناز سے آئی
سینوں میں در آئی تو کلیجوں میں سمائی
سب بھول کے دنیا کی طرف ہو گئے ظالم
کروٹ ابھی بدلی تھی کہ پھر سو گئے ظالم

دنیا کے تماشے سے ہوئے اہل جفا کور
تلواریں کھنچیں میان سے، قرنا کا اٹھا شور
گھوڑوں کو سنبھالنے لگے میدان میں شہ زور
ڈھالیں جو اٹھیں رن میں گھٹا چھا گئی گھنگھور
سایہ کیا پر کھول کے ہیبت نے فضا پر
چوٹیں وہ تواتر سے پڑیں طبل وغا پر

حضرت نے کہا، "شکر ہے کامل ہوئی حجت
ہو جائے گی اب امتِ بیمار کو صحت

اے خالقِ کونین یہ بندے پہ عنایت
بخشی ہے مجھے خدمتِ تکمیلِ نبوت
ڈرتا ہوں خوشی کی کہیں تکمیل نہ ہو جائے
اشکوں میں لہو جسم کا تبدیل نہ ہو جائے

ہر چند بظاہر یہ مصیبت کے ہیں ساماں
جب دیکھتا ہوں غور سے، کچھ راز ہیں پنہاں
ظاہر میں جو کانٹے ہیں وہ در پردۂ گلستاں
یہ گرد نہیں، حضرتِ یوسف کا ہے داماں
ہاتھوں پہ لئے تاجِ صداقت نکل آئی
جب چاک ہوا، عیش کی صورت نکل آئی

بس اتنے میں ناگاہ برسنے جو لگے تیر
خیمے کی طرف دیکھ کے چپ ہو گئے شبیر
گھوڑے کو بڑھا کر یہ پکارے شہِ دلگیر
مجبور ہوں، اب کھینچتا ہوں میان سے شمشیر
ہنگامِ دغا برق ہوں، طوفان ہوں، غضب ہوں
ہشیار کہ میں روحِ شجاعانِ عرب ہوں

وہ سامنے آئے جیسے مرنا ہو گوارا
بہتا نظر آئے گا یہاں خون کا دھارا
گھٹ جائے گا دم بھر میں ابھی زور تمہارا
رہتا ہے سدا حق کا بلندی پہ ستارا
جنگاہ میں باطل کے قدم گڑ نہیں سکتے
دیکھو کہے دیتا ہوں کہ تم لڑ نہیں سکتے

جو سخت ہے، جرأت کبھی اس دل میں نہیں ہے
حق، حق نہ رہے، زور یہ باطل میں نہیں ہے
سطوت کی صفت، فرقۂ غافل میں نہیں ہے
ہمت کا نشاں، فطرتِ جاہل میں نہیں ہے
نامرد کبھی تابِ جفا لا نہیں سکتا
کافر کبھی مومن پہ ظفر پا نہیں سکتا

جس قلب میں ہے کفر، وہ دوزخ کا دھواں ہے
جس دل میں معارف ہیں، وہ اک برقِ تپاں ہے
باطل کا جو حامی ہے، وہ بے نام و نشاں ہے
جو حق کا طرفدار ہے، اک شیرِ ژیاں ہے
سچائی کے قدموں پہ سرِ فتح و ظفر ہے
جرأت بھی اسی سمت ہے، ایمان جدھر ہے

جو لوگ کہ ڈر جاتے ہیں بادل کی صدا سے
کانپ اٹھتے ہیں بچوں کی طرح ذکرِ وغا سے
جب ہوتی ہے مذہب کی کشش فضلِ خدا سے
ڈٹ جاتے ہیں، دبتے نہیں اربابِ جفا سے

ہرگز نہ ڈرو کفر سے ایماں کا سبق ہے
ان کی یہ شجاعت نہیں، یہ قوتِ حق ہے

بزدل میں بھی جب قوتِ حق بھرتی ہے جرأت
آتی بھی نہ حق کیا تجھے بکنے کا جلالت
دکھلا دوں میں تم کو یہ ہوتی ہے شجاعت
حاصل ہے مجھے قوتِ حق زورِ امانت

یہ جنگ کا طوفان ہے کچھ سیر نہیں ہے
میدان سے ہٹ جاؤ کہ اب خیر نہیں ہے

مولا کا مزاج اتنا جو برہم نظر آیا
لشکر پہ عجب خوف کا عالم نظر آیا
سامانِ جفا درہم و برہم نظر آیا
کی جس سرِ خیرہ پہ نظر خم نظر آیا

خاموش صفیں یاس کے عالم میں کھڑی تھیں
مردہ تھیں نگاہیں کہ زمینوں میں گڑی تھیں۔

لکھا ہے اُدھر تھا ابنِ قطبہ کوئی سردار
مرحب سے بھی کچھ بڑھ کے شجاعت میں نمودار

بدمست، کئی من کا، سجے جسم پہ ہتھیار
نعرہ تھا کہ خالی نہیں جاتا ہے مرا وار

دو سو تھے زرہ پوش ستمگار کے پیچھے
جس طرح کہ بل کھاتی ہے دُم مار کے پیچھے

آیا عجب انداز سے میداں میں ستمگر
ڈوبا ہوا فولاد کے ساماں میں سراسر

کف منہ میں، لہو جوش میں غصے سے جبیں تر!
ہتھیاروں کی آواز، تو وہ زین کی چرمر!

دل میں تھا غضب، نشۂ پندار تھا سر میں
اک تیغ تو تھی ہاتھ میں اور ایک کمر میں

اس طرح جو آیا وہ قریبِ شہِ ابرار
مولیٰ نے کہا "او نارِ جہنم کے طلب گار

اب دیر مناسب نہیں، ہاں وار بس اب وار
جوہر جو دکھانا ہوں تو بڑھ تول کے تلوار

ہم وہ ہیں کہ دشمن پہ بھی شدت نہیں کرتے
جو حق کے پرستار ہیں سبقت نہیں کرتے

یہ سن کے بڑھا تول کے نیزہ جو وہ گمراہ
رستم کی صدا آئی کہ العظمتُ لِلّٰہ

نیزے کو ابھی اس نے گھمایا تھا کہ ناگاہ
ترچھی ہوئی اس شان سے شمشیر یداللہ

کم بخت کے نیزے کے لیے ضرب فنا تھی
اس حسن سے کاٹا تھا کہ ہر پور جدا تھی

غصے میں کماں لے کے بڑھا نیب وہ ستمگار
بے رحم نے چلے سے بڑھایا لب سوفار

شبیر نے یہ دیکھ کے چمکایا جو رہوار
نیزے پہ اڑا لائے کماں سید ابرار

ظالم نے کماں دیکھی جو نیزے کی انی پر
اک تیر سا گویا کہ لگا قلب شقی پر

شرمایا تو مردود بڑھا تول کے تلوار!
تا دیر شہ دیں پہ نواسرے کئے وار

بھینسے کی طرح ہانپ رہا تھا وہ بد اطوار
حضرت نے کہا، واب مری باری ہے خبردار

اتنی تو خبر تھی کہ چلی فرق لعیں پر
دیکھا تو اتر آئی تھی مرکب سے زمیں پر

خوں پونچھ کے حضرت نے کیا نعرۂ تکبیر
تلوار سے ہنس کر یہ کہا، واہ ری شمشیر

چلتی ہے تو کرتی نہیں دم بھر کی بھی تاخیر
کس حسن سے تو کھینچتی ہے موت کی تصویر

تو موت کا سیلاب ہے تو برق فنا ہے
پیغام اجل کا ترے دامن کی ہوا ہے

مارا گیا اس طرح لشکر کا نمودار
چہروں سے اڑے رنگ وہ گھبرا گئے کفار

حضرت نے ڈپٹ کر یہ کہا "فوج بد اطوار"
بڑھتا نہیں تم میں سے کوئی کھینچ کے تلوار

سردار کے مرنے کا تمہیں درد نہیں ہے
کیا اتنے جوانوں میں کوئی مرد نہیں ہے

یہ فوج کا انبوہ، یہ میں یکہ و تنہا
مارا ہوا صدموں کا کئی روز کا پیاسا

یہ کیا ہے لاکھوں کو نہیں جنگ کا یارا؟
تف اے سپہ شام! شجاعت وہ ہوئی کیا

تم لرزہ براندام ہو عزت گئی سب کی
تکلیف میں روحیں ہیں شجاعان عرب کی

یہ سن کے بھی جب کوئی نہ میدان میں آیا
نمودان کی طرف آپ نے گھوڑے کو بڑھایا

تلوار چمکنے لگی، گرنے لگے اعدا
دو ہو گیا کوئی، کوئی تڑپا، کوئی بھاگا

آنکھوں میں چکا چوند تھی حیراں تھے ستمگر
آپس میں مگر دست و گریباں تھے ستمگر

جس سمت جھپٹتا تھا وہ شیرِ صفِ جنگاہ
گر گر کے فنا ہوتے تھے وہ گھوڑوں سے بدخواہ
کفار میں تھا شور کہ اَلعَظمَتُ لِلّٰہ
آتی بھی ہیں شیروں کے مقابل کہیں روباہ

ترتیب صفوں میں تھی، نہ وہ شان پروں کی
برسات کا طوفاں تھا بارش تھی سروں کی

کیا جوہرِ شمشیر تھا، کیا زورِ شجاعت
نزدیک کوئی آئے، نہ پڑتی تھی یہ ہمت
تابندہ خط و خال میں تھی برقِ امامت
حیدرؑ کی جو سطوت تھی تو حمزہؓ کی جلالت

شمشیر نہ تھی، فوج پہ بجلی کی چمک تھی
یا ابرِ سیہ تاب میں کوندے کی لپک تھی

جس سر پہ چلی پیکرِ بے جان نظر آیا
جس سمت گئی، خون کا طوفان نظر آیا
اونچی جو ہوئی برق کا داماں نظر آیا
نیچی جو ہوئی قبر کا ساماں نظر آیا

تلوار تھی، یا ساز، کہ نغمہ تھا اس کا
تھا مرکز، آوازِ قضا زیر و بم اس کا

مصروف ابھی جنگ میں تھے حضرتِ شبیر
آواز اک آئی کہ "بس اب روک لے شمشیر

لازم ہے تجھے امت کی شفاعت کی تدبیر
پی جام شہادت کہ بڑھے عزت و توقیر
طوفان سے بچا حق کو، ہو اپنا بہا دے
امت کو بہادر ہے، تو اب مر کے جلا دے
جھنکار سے میدان دغا گونج رہا تھا
ناگاہ پئے صبر و رضا حکم جو پہنچا
یوں میاں میں چلتی ہوئی تلوار کو رکھا
غل جن و ملائک میں اٹھا صل علیٰ اسکا
ایمان کی ڈوبی ہوئی نبضیں ابھر آئیں
خدمت کے لئے چرخ سے حوریں اتر آئیں
ذروں پہ جو سجدے میں جھکے حضرت شبیر
چلنے لگے ہر سمت سے تیغ و تبر و تیر
بے کس پہ چمکنے لگی شمشیر پہ شمشیر
سر پیٹ کے کہنے لگی یہ زینب دل گیر
چھوٹوں گی نہ اس غم میں کبھی نوحہ گری سے
آندھی کا تنہا دم ہے چراغ سحری سے
ہے ہے کوئی عباس دلاور کو پکارا
بابا برا وقت ہے اکبر کو پکارا
اکبر نہیں ملتے ہیں تو اصغر کو پکارا
بیٹے پہ چھری چلتی ہے حیدر کو پکارا

زہرا کی وہائی ہے، ہمیشہ کی دہائی
پھٹتا ہے جگر خالقِ اکبر کی دہائی

حضرت نے زینب کی سنی گریہ و زاری
چپ ہو گئے وہ قلب پہ حالات ہوئی طاری

تلواریں لگانے لگے بڑھ بڑھ کے جو ناری
مولا نے کہا شکر ہے اے ایزدِ باری

کٹتا ہے گلا بھائی کا ہمشیر کے آگے
تدبیر سرِ خاک ہے تقدیر کے آگے

تڑپے جو کئی بار زمیں پر شہِ والا!
سمجھے یہ ملائک کہ قیامت ہوئی برپا

خیمے کو بڑی یاس سے مظلوم نے دیکھا
اتنے میں کسی سمت سے اک تیر وہ آیا

پامالِ صفِ لشکرِ غم ہو گئے مولیٰ!
دل میں وہ اٹھا درد کہ خم ہو گئے مولیٰ

رک رک کے جو تلوار چلی خشک گلے پر
زہرا کی صدا آئی کہ "آہستہ ستم گر"

حیدر نے بڑے پیار سے زانو پہ لیا سر
گردوں کی طرف دیکھ کے بولے یہ پیمبر

شکوہ نہیں نکلا مرے پیاسے کے لبوں سے
نکلی ہے مری روح نواسے کے لبوں سے

ناشاد تری بے کسی و یاس کے قرباں
نازک یہ ترا جسم یہ تپتا ہوا میداں
ٹکڑے یہ بدن کے، یہ روا خون میں غلطاں
ذرّوں پہ ہیں قرآن کے اوراق پریشاں
بے کس ترے اکبر کی جوانی کے تصدق
مظلوم! تری تشنہ دہانی کے تصدق

تو اور سرِ خاک مرے گیسوؤں والے
یہ دل، یہ بلائیں، یہ زباں اور یہ چھالے
اس پیاس میں گردن پہ چھری جسم پہ بھالے
افسوس ہے اے فاطمہؓ کے ناز کے پالے
عبرت کا وہ منظر ہے کہ خود ظلم خجل ہے
یہ لاش نہیں خاک پہ اسلام کا دل ہے

یہ شام کا ہنگام، یہ اندوہ، یہ میداں
یہ ہُو کا سماں، اور یہ سنسان بیاباں
رانڈوں میں تلاطم ہے، اداسی کے ہیں ساماں
سوتے ہیں پڑے شام سے خیمے کے نگہباں
غم اتنے ہیں اور ایک بھی غمخوار نہیں ہے
جز ذاتِ خدا کوئی مددگار نہیں ہے

سیدانیوں کے بیچ میں ہیں عابدِ مضطر
منہ دیکھتی ہے سب کا سکینہ ہے ششدر

ہاتھوں سے جگر تھام کے کہتے ہیں یہ شبیر
بیٹا! یہ ستمگر کی انی اور ترا سینہ
آثار ابھی تک مری الفت کے عیاں ہیں
اس حلق پہ اب تک مرے بوسوں کے نشاں ہیں
مصروف یہ شبیر تھے ابھی آہ و بکا میں
آہستہ سے جنبش سی ہوئی موجِ ہوا میں
آواز اک آئی "نہ تڑپ دشتِ بلا میں
سر رکھا ہے شبیر کا حوروں کی ردا میں
اس خون کو ہر خون سے ممتاز کیا ہے
ہم نے ترے بچے کو سرفراز کیا ہے
اے جوش یہ اب تک ہے اسی خون کی تاثیر
ہوتی ہے بالاعلان بڑی شان سے تکبیر
اب بھی جنہیں ملتی ہے رہِ عشق میں تعزیر
صد شکر کہ خوش ہو کے پہن لیتے ہیں زنجیر
ڈرتے ہی نہیں دیکھ کے جلاد کی صورت
زنداں میں چلے جاتے ہیں سجاد کی صورت
اک کھیل ہے ان کے لئے شاہوں کی جلالت
سینوں میں ہے ایمان زبانوں پہ صداقت
کوشش ہے کہ آزاد ہوں پابندِ مصیبت
سر جائے تو جائے، نہ گرے تاجِ خلافت

تقدیر یہ ہے جس قلب میں ایماں کی بو ہے
پنجاب سے تا کر دہ گناہوں کا لہو ہے

بے درد کی حسرت کو نکلتے نہیں دیکھا
کاغذ کی کبھی ناؤ کو چلتے نہیں دیکھا

ظالم کو کبھی پھولتے پھلتے نہیں دیکھا
ٹھوکر یہ وہ ہے جس سے سنبھلتے نہیں دیکھا

وہ تخت ہے کس قبر میں وہ تاج کہاں ہے
اے خاک بتا، زور یزید آج کہاں ہے

احساس نہیں جس میں وہ تاریک ہے سینہ
دوزخ اترتا ہے سدا ظلم کا زینہ

پستی کے علامات ہیں، انصاف سے کینہ
جو حق سے لڑا ڈوب گیا اس کا سفینہ

ہاں پیروِ باطل کو ابھرتے نہیں دیکھا
جب زلف یہ بگڑی تو سنورتے نہیں دیکھا

اے قوم! وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ
اسلام ہے پھر تیر حوادث کا نشانہ

کیوں چپ ہے اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ
تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ

مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر فرد حسینؑ ابن علیؓ ہو

یہ مذکورہ نظم سنہ ۱۹۱۸ء کی ہے جو غالباً سنہ ۱۹۲۰ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس نظم کو صرف اس نظریہ سے پڑھا جاسکتا ہے کہ یہ آج سے اٹھارہ برس پیشتر کی چیز ہے:

اے مومنانِ لکھنؤ

آج پھر شاعر کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے لہو
اے محبانِ علیؑ، اے مومنانِ لکھنؤ

یہ نہیں کہتا کہ شاہنشاہ پر تم روئے کیوں
آنسوؤں سے نامۂ اعمال تم نے دھوئے کیوں

دل پہ حالت کیوں ہوئی طاری غم آور قوم کی
چوڑیاں کیوں کی گئیں ٹھنڈی عروسِ قوم کی

سخت حیراں ہوں مگر اے امتِ بدرِ حنین
دنیوی تصویرِ غم کا شبیہۂ خونِ حسینؑ

پختگی ایماں کی ہو مجروح، وہمِ خام سے
خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں دلِ اسلام سے

رفعتیں ہستی ہیں جس کی گنبدِ افلاک پر
تاج کا سایہ پڑے اس کربلا کی خاک پر

حق پرستوں کی طرف سے اور یہ توہینِ حق
غیرتِ ملت کے ماتھے سے ٹپکتا ہے عرق

ممبرِ سبطِ نبیؐ پر اور سیاسی شور و شین
مجھ سے آنکھیں تو ملاؤ سوگوارانِ حسینؑ

دین بھی اب کانپتا ہے عسکری قانون سے
تیغ کا پانی ہے بھاری کربلا کے خون سے

پیغمبرِ اسلام

نگاہِ فطرت کی ضَو سے یوں تو ہر ایک ذرّہ جھلک رہا ہے
ہر ایک قوت ابھر رہی ہے ہر ایک پودا پھبک رہا ہے

دبے ہیں ذرات کی تہوں میں ہزار اسرار کے خزانے
ازل سے آغوشِ خار و خس میں کھلے ہیں پھولوں کے کارخانے

ہوائے نشو و نما کا جھونکا ہر اک چمن سے گزر رہا ہے
ہر ایک خوشہ ہے محوِ زینت، ہر اک شگوفہ سنور رہا ہے

ازل کے دن جس طرح ملی تھی جمود کو رخصتِ روانی
مچل رہا ہے رگِ جہاں میں اسی طرح خونِ زندگانی

اگرچہ صدیاں گزر چکی ہیں پڑے ہیں کیا کیا حجاب ابتک
مگر زمانے کے خال و خط سے ٹپک رہا ہے شباب ابتک

ادا سے چلتی ہے گلستانِ جہاں میں بادِ بہار اب بھی
زمانہ ہے رحمتوں کی تازہ نوازشوں سے دوچار اب بھی

جبینِ لیلائے شب ہے روشن روپہلی قندیل سے قمر کی
سنہری کنگن میں ہنس رہی ہے کلائی دوشیزۂ سحر کی

عطا و انعام کے فرشتے یہاں سدا پیش و پس رہے ہیں
زمیں پہ صبحِ ازل سے اب تک کرم کے بادل برس رہے ہیں

مگر یہ سب ہے تمہارا تحفہ، زمیں کو فطرت جو بخشتی ہے
کوئی حقیقی ہے ان میں نعمت تو وہ اک آزاد آدمی ہے

وہ آدمی، موجِ زندگی سے نگاہ جس کی دھلی ہوئی ہے
وہ آدمی جس کے ہر نفس میں کتابِ حکمت کھلی ہوئی ہے

وہ آدمی جس کی تیز نظریں، مزاجِ عالم کی راز داں ہیں
وہ آدمی، نبضِ پیچ و تابِ حیات پر جس کی انگلیاں ہیں

وہ آدمی، جس کا جامِ الفت، خنک ستارے پئے ہوئے ہیں
وہ آدمی، گرد و پیش جس کے فرشتے حلقہ کئے ہوئے ہیں

وہ آدمی، جس کے پاک دل میں پیامِ فطرت چھپا ہوا ہے
وہ آدمی، جس کا گرم ناخن ربابِ ہستی کو چھو رہا ہے

وہ آدمی، جو نسیمِ گل سے علوم کے پھول چن رہا ہے
وہ آدمی، جو ہوا کی رو میں خدا کا پیغام سن رہا ہے

اگرچہ نقشِ قدم پر اس کے ازل سے سجدے میں آسماں ہیں
مگر غضب تو یہ ہے جہاں میں اسی سے بے اعتنائیاں ہیں

بہت سے گزرے ہیں یوں تو انساں خرد کی شمعیں جلانے والے
بتوں کی ہیبت اٹھانے والے، خدا کا سکہ بٹھانے والے
مگر عرب کے خموش افق سے کہاں وہ پھوٹی رسول بنکر
کہ جتنے ظلمت کے خار و خس تھے دہک اٹھے سرخ پھول بن کر
ابھی تک انکار پر مصر ہے، دماغ مختل ہے کافری کا
نظام قدرت سے ہے نمایاں ثبوت اس کی پیمبری کا
کوئی فلاحت کا ہے وہ ماہر؟ کہ یہ حقیقت کرے ہویدا
کہ خار سے تخم نے کیا ہے کبھی صدی میں گلاب پیدا
کوئی نظیر اس کی مل سکے گی؟ کہ آگ پانی سے جل سکی ہے
زمین ٹھنڈک کا سکی ہے تارے؟ چٹان موتی اگل سکی ہے
کبھی کوئی جنس اپنی ضد کی طرف زیادہ اگر بڑھی ہے؟
کلی سے شعلے کبھی اٹھے ہیں؟ شرر سے شبنم کبھی گری ہے؟
دیارِ باطل کے کارواں کو سراغِ دین و ملل ملا ہے؟
کسی کو خشکی کا بیج بو کر کبھی سمندر کا پھل ملا ہے؟
سرشت جو خشت کی نہ سمجھے، مزاج جو سنگ کا نہ جانے
زبان اس کی سنا سکے گی ستون و محراب کے فسانے؟
وہ خفتہ معمار، جو نہ جانے کہ فنِ تعمیر کیا بلا ہے
محل کا کیا ذکر، اک گھروندا بھی زندگی بھر بنا سکا ہے
بنا سکے گا بھی وہ اگر کچھ، نہ رہ سکے گا نشان اس کا
رہے گا مٹی کا ڈھیر ہو کر ضرور اک دن مکان اس کا

اسی طرح وہ، جو دوسروں کی بہارِ حکمت کا خوشہ چین ہے
اسی طرح وہ، جو کہہ رہا ہے "و نبی ہوں" لیکن نبی نہیں ہے

وہ ایک پودا ہے باغِ عالم میں جو مسلسل نہ پھل سکے گا
کبھی اس آشفتہ سر کا مذہب جہاں میں صدیوں نہ چل سکے گا

بھلا یہ ممکن ہے کذب پر ہو بنا اک دین مستقل کا؟
گراں بہا وقت کی جبیں پر نشاں ہو اک پائے مضمحل کا!

دروغ، اور یہ فروغ پائے، دلوں پہ حاصل ہو پادشاہی!
اور اس کی حقانیت پہ صدیوں کروڑوں انساں دیں گواہی

یہ ہم نے مانا کہ جھوٹ کو بھی فروغ ہوتا ہے لیکن اتنا
سبک شگوفوں سے چھیڑ کرتا گزر گیا اک ہوا کا جھونکا

مگر وہ ہستی جو آج لاکھوں خدا کے بندوں کی حرزِ جاں ہے
وہ محض اک شعبدہ ہو! ناداں! بتا فراست تری کہاں ہے

سراب کو لاکھ کوئی پوجے، پر ایک قطرہ نہ پی سکے گا
یہ یاد رکھو دروغ صدیوں نہ جی سکا ہے، نہ جی سکے گا

خدا کے وہ بے شمار بندے کہ مستحق ہیں تو ارشود کے
رہیں وہ صیدِ زبوں مسلسل ذلیل و ناپاک ساز شوں کے

اگر یہ ہم مان لیں کہ دنیا طلسم خانہ ہے شیطنت کا
مذاق اڑانا پڑے گا ہم کو خدا کے ذوقِ ربوبیت کا

دروغ میں سب سے ہو جو بڑھ کر، وہی خدائی کا دہنما ہے
اگر یہ سچ ہے تو پھر خدا کا جلال محض اک ڈھکوسلا ہے

سنو! کہ جھوٹا کبھی نہ ہوگا جو دل میں رکھتا ہے کوئی جوہر
اگر ہے شک، تو نگاہ ڈالو خصوصیاتِ پیمبری پر
وہ روح، بنیاد کہہ سکیں ہم جسے اک آئین مستقل کی
ہمیشہ ڈوبی ہوئی ملے گی خموش گہرائیوں میں دل کی

بقائے انسانیت کی خاطر جو قلب، جویائے راز ہوگا
نظامِ تخلیق و روحِ عالم سے محوِ راز و نیاز ہوگا
وہ پاک ہستی، جو نوعِ انساں کی فکر میں بے قرار ہوگی
بشر کی پنہاں ترین حس سے نگاہ اس کی دو چار ہوگی

سدا منقش ہیں اس کے دل پر عظیم اشکالِ آسمانی
ہمیشہ پیشِ نظر ہے اس کے کشاکشِ مرگ و زندگانی
جلاتا رہتا ہے تازہ شمعیں وہ ہر نفس، بزمِ آب و گل میں
سوالِ علم و عمل کا شعلہ لرزتا رہتا ہے اس کے دل میں

جو ان حقائق میں غرق ہوگا، بھلا وہ حد سے گزر سکے گا؟
جو رازِ فطرت سے آشنا ہو، وہ جھوٹ برداشت کر سکے گا؟
پس ان دلائل کی روشنی میں ضرور یہ ماننا پڑے گا
کہ ہے پیامِ خدائے برتر، پیامِ پیغمبرِ عرب کا

سنے ہوئے اس پیامِ حق کو اگرچہ صدیاں گزر چکی ہیں
بہت سی قومیں ابھر کے ڈوبیں، ہزاروں جی جی کے مر چکی ہیں
مگر حروف اس کے ہیں کہ اب تک اسی طرح سے جھلک رہے ہیں
ہر ایک نقطے سے تازگی کے ہزاروں شعلے بھڑک رہے ہیں

کبھی تو کر غور اپنے جی میں کہ اس رُتوں میں یہ بات کیوں ہے؟
اگر یہ تیرے عینِ حق نہیں ہے تو پھر یہ رنگِ ثبات کیوں ہے؟
اگر یہ مصحف نہیں تو ہاتھوں پہ کیوں مشیت سنبھالے ہوئے ہے؟
اگر غلط ہے تو کیا خدا کا جلال سازش کئے ہوئے ہے؟
اگر یہ بے جان مسئلہ ہے تو زندگی کا یہ جوش کیوں ہے؟
اگر یہ تکذیب کا ہے شایاں، زبانِ فطرت خموش کیوں ہے؟
جو جانچنا ہے تو کیوں نہ پھر ہم ہر ایک پہلو کو دیکھیں بھالیں؟
ثبوتِ پیغمبری کی خاطر، عرب پر آؤ نگاہ ڈالیں!
عرب، وہ ریگِ رواں کا عالم، سراب کی ہولناک دنیا!
وہ سرخ ذرات کا سمندر، تپش کا وہ خوفناک صحرا!
وہ مسندِ نوفیسِ دفاراں، وہ مسند و تختِ شاہِ خاور
جہاں جنگ و جدال و غارت، مقامِ تیغ و سنان و خنجر
حدودِ امن و اماں سے باہر، لباسِ شائستگی سے عاری
گرج سے افلاک زلزلے میں، کڑک سے لرزاں زمین ساری
سفید، اندیشۂ دغا سے، سیاہ گردِ مبارزت سے
برادری سے جہاں کی خارج، الگ شعارِ معاشرت سے
زمینِ فتنہ، دیارِ شورش، مقامِ گریہ، محلِ زاری
نہ علمِ ظاہر، نہ نورِ باطن، نہ حُبِّ انساں نہ خوفِ باری
وہ گرم پست و بلند ٹیلے، وہ ہولِ بادِ سموم و طوفاں
وہ رعب و جبروتِ شاہِ خاور، وہ بخل و امساکِ ابرِ باراں

درون میں وہ ایک دبدبے سے قطارِ اُشتر قدم جمائے
اِدھر اُدھر وہ جبالِ سرکش، غرور سے گردنیں اُٹھائے

غضب ہے آبادیوں کے باہر، اُدھر دہکتی ہوئی چٹانیں
ستم ہے آبادیوں کے اندر، اِدھر کڑکتی ہوئی کمانیں

یہ ملک، اور اک یتیم بچہ، نہ کوئی وارث، نہ کوئی والی!!
سرہانے اک پیر سال خوردہ، اسیرِ صد ضعف خستہ حالی

نہ باپ سر پر، نہ ماں کا سایہ، بلا نصیب و ستم رسیدہ
مقامِ عبرت کا رہنے والا، نہ شاد و فرحاں، نہ آبدیدہ

کتاب سے نابلد، مبرّا، فیوضِ تعلیم و تربیت سے
کھلیں جو آنکھیں تو بند پائی عدو کی ہر راہ شش جہت سے

پلا ہو بے باپ کا جو بچہ! عرب میں اور پھر اس ابتری سے
اگر پیمبر نہیں، تو واقف ہوا وہ کیونکر پیمبری سے

پیامِ بیگانۂ تمدن، بنائے تہذیب ڈالتا ہے؟
دماغِ پروردۂ بیاباں، جہاں کو سانچے میں ڈھالتا ہے؟

وہ طفل، پروان جو چڑھا ہو دیارِ اصنامِ آذری میں
صدائے توحید سے ڈالے وہ شگاف محرابِ کافری میں

اگر صدا اس نبیِ اُمّی کی آسمانی صدا نہیں ہے
تو پھر کہاں سے یہ فیض پہنچا؟ جواب اس بات کا نہیں ہے

عرب کے ہیرو، عجم کے سلطاں، نظامِ ارض و سما کے والی
زمیں پہ لطف و کرم کی تو نے عجب بنائے لطیف ڈالی!

چلا جو دوشِ صبا پہ میرا پیام ابرِ بہار بن کر !!
تمام باطل کے سنگریزے مہک اٹھے برگ و بار بن کر

مشیتِ ایزدی کے دل سے بنا ہے شاید دماغ تیرا
وگرنہ کیوں طاقِ بادِ صرصر میں جل رہا ہے چراغ تیرا

دبے ہیں سینے میں، زندگی کے بہت سے جوہر ابھرنے والے
اِدھر بھی ہاں اک نظر خدارا دلوں کے بیدار کرنے والے

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیٔ مئے ناب و سفینۂ غزل است
(حافظ)

بادۂ سرجوش

(۱)

جدید رنگِ تغزّل

دِل، رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے!
اُسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے!
ذرّات کو چھوڑ کر حریفوں کے لئے!
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے!

(سنہ ۱۹۲۶ء کے بعد کی غزلیں) (مصنّف)

صبح، بالیں پہ یہ کہتا ہوا غمخوار آیا
اُٹھ کہ فریاد رسِ عاشقِ بیمار آیا

بختِ خوابیدہ گیا ظلمتِ شب کے ہمراہ
صُبح کا نُور، لیے دولتِ بیدار آیا

خیر سے باغ میں پھر غنچۂ گل رنگ کھلا
شکر ہے دَور میں پھر ساغرِ سرشار آیا

جھُوم اے نشۂ گلبانگِ نگارِ عشرت
کہ لبِ یار لیے چشمۂ گفتار آیا

شکرِ ایزد کہ وہ سرخیلِ مسیحا نفساں
زُلفِ بردوش پئے پرسشِ بیمار آیا

رخصت اے شکوۂ قسمت! کہ سرِ بزمِ نشاط
ناسخِ مسئلۂ اندک و بسیار آیا!

لِلّٰہ الحمد کہ گلزار میں ہنگامِ صبُوح
حکمِ آزادیِ مرغانِ گرفتار آیا

غنچۂ بستہ! چٹک، جاگ، اٹھی موجِ صبا
شعلۂ عشق! بھڑک، مصر کا بازار آیا

خوش ہو اے عشق کہ پھر حسن ہوا مائلِ ناز
مژدہ اے جنسِ محبّت! کہ خریدار آیا

اے نظر! شکر بجا لا کہ کھلی زلفِ دراز
اے صدف! آنکھ اٹھا، ابرِ گہربار آیا

بادباں! ناز سے لہرا کہ چلی بادِ مراد
کارواں! عید منا، قافلہ سالار آیا

خوش ہو اے گوش! کہ جبریلِ ترنم چہکا
مژدہ اے چشم! کہ پیغمبرِ انوار آیا

خوش ہو اے پیرِ مغاں! خوش ہو اے نغمہ فروش
مژدہ اے دخترِ رز! رندِ قدح خوار آیا!

اے حسن! اگر عشق خریدار نہ ہوتا
یہ غلغلۂ گرمیِ بازار نہ ہوتا!

نالوں سے مرے چرخ اگر گونج نہ اٹھتا
یہ زمزمۂ نطقِ گہربار نہ ہوتا

غم سے مرے، چہرے پر اگر خاک نہ اڑتی
یہ فتنۂ رنگِ لب و رخسار نہ ہوتا

انکار کو شاعر نہ سمجھتا اگر اقرار
اقرار میں یوں پہلوئے انکار نہ ہوتا

آتی نہ اگر مجھ کو جماہی پہ جماہی!
یہ میکدۂ نرگسِ بیمار نہ ہوتا

میں آہ نہ بھرتا تو ترا لعلِ نگاریں
گل بیز، گل افشاں و گہربار نہ ہوتا

میں شوقِ شہادت میں اگر سر نہ جھکاتا
یہ عربدہ، چلتی ہوئی تلوار نہ ہوتا!

یہ تاب و تبِ مشعلِ انداز نہ ہوتی
یہ طنطنۂ طرّۂ طرار نہ ہوتا

یہ برہمیِ گیسوئے شب رنگ نہ ہوتی
یہ پیچ و خم کاکلِ خم دار نہ ہوتا!

معشوقوں کو نہ ملتا کبھی یہ منصبِ عالی
انداز بایں قیمت و مقدار نہ ہوتا

اس مستیِ رفتار سے، اس لغزشِ پا سے
سویا ہوا فتنہ کوئی بیدار نہ ہوتا

دیتا نہ انکو تاج و کمر تجھ کو دلِ جوش
کونین کا تو مالک و مختار نہ ہوتا

خبر کر اے دل کہ پھر وہ شاہِ خوباں آئیگا
پھر ترے پہلو میں یارِ فتنہ ساماں آئے گا

کیوں نہ آئیں پھر کہ پھر اس خلوتِ خاموش میں
اک نہ اک دن یارِ رقصاں و غزلخواں آئے گا

جان اے ناعاقبت اندیش، رو رو کر نہ دے
کیا کرے گا پیش جب وہ مالکِ جاں آئے گا!

دھو نہ بام و در کی نقاشی کہ پھر اس قصر میں
گنگناتا قاصدِ شمعِ شبستاں آئے گا! !

شغل نہ کر شانوں کو ماتم سے کہ کل اس راہ میں!
لہر کھاتا ہوا وہاں زلفِ پریشاں آئے گا! !

سرو و سنبل کی نگہداری سے غافل ہوشیار
اس چمن میں، پھر پیامِ ابرو باراں آئے گا!

سبزۂ خوابیدہ کو سرسبز رکھ، اے باغباں
پھر پئے گل گشت وہ سروِ خراماں آئے گا!

سرنگوں ہیں گل تو کیا پروا کہ پھر وہ لالہ رُخ
صد گلستاں برکفِ و صد گل بداماں آئے گا

تہ نہ کر اے جوشؔ، فرشِ بادہ خواری تہ نہ کر
کل یہیں گردش میں پھر جامِ زرافشاں آئیگا

صد شکر کہ پھر زیست کا ساماں نظر آیا
پھر در پہ کوئی فتنۂ دوراں نظر آیا

پھر رطلِ گراں مست ہوا نکہتِ مے سے
پھر ذوقِ طرب سلسلہ جنباں نظر آیا!

پھر کاکلِ ژولیدہ سے جھلکا رُخِ رنگیں
پھر ابر کے سائے میں گلستاں نظر آیا

اشکوں کی جھڑی بند نہ ہوتی تھی کسی طرح
صد شکر ترا گوشۂ داماں نظر آیا

لو کاکلِ شب رنگ کھلی، کھل گئیں آنکھیں
اڑتا ہوا رنگِ شبِ ہجراں نظر آیا

بشاش ہو جمعیتِ خاطر کی تمنا
لے، سلسلۂ زلفِ پریشاں نظر آیا

اب تک نہ خبر تھی مجھے اجڑے ہوئے گھر کی
تم آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا

انگڑائیاں لیتا کوئی اے جوشِ دمِ صبح
خورشید سے پھر دست و گریباں نظر آیا

کرم پھر، شکر ہے، اخلاص کا بازار ہوا
پھر نیا عہدِ میانِ دل و دل دار ہوا!

للہ الحمد کہ گلشن میں پھر اک عمر کے بعد
جشنِ گل پوشئ رندانِ قدح خوار ہوا

طے ہوئی پھر خلشِ شام و سحر کی منزل
عام پھر غلغلۂ کاکل و رخسار ہوا!

منصبِ ناز پہ فائز نہ ہو کیوں روحِ نیاز
صید کے دام میں صیاد گرفتار ہوا

کاروانِ دلِ برباد کا، صد شکر، کہ پھر
غمزۂ ہوش رُبا، قافلہ سالار ہوا

اُفقِ ذوقِ سماعت پہ ہیں آثارِ طلوع
کہ لبِ لعل پھر آمادۂ گفتار ہوا!

نرخ دہ چند کر اے حسرتِ شرحِ آلام
کہ وہ پھر حرفِ حکایت کا خریدار ہوا
کل تھے اقرار کے پردے میں ہزاروں انکار
آج انکار کے انداز سے اقرار ہوا!

آرزو وجد میں ہے دھوم ہے ارمانوں میں
کہ وہ پھر جوشش کی تائید پہ تیار ہوا

محفلِ عشق میں وہ نازشِ دوراں آیا
اے گدا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا
اے کلی ناز سے کِھل، بادۂ سرجوش اُبل
کہ نگارِ چمن و شاہدِ مستاں! آیا
دُور اے زاہد! کہ وہ زہد شکن آپہنچا!
رخصت ایماں! کہ وہ غارت گرِ ایماں آیا
خاطرِ جمع سے ہشیار، کہ برہم ہوئی زلف
کشتیٔ دِل سے خبردار کہ طوفاں آیا!
بوستاں وجد میں آ، عشق! غزلخواں ہو جا
کہ گلِ سرسبد و سروِ خراماں آیا!
اے چمن! عیدِ منا، ابر ہوا گرمِ خرام
اے ضیا! ناز سے چل، موسمِ باراں آیا

مژدہ اے کارِ گرہ بستہ، کہ ہمراہِ نسیم
پیکِ مشکیں نفسِ کاکلِ پیچاں آیا!

شاد باش اے سحرِ عید، کہ بالیں پہ مری
یار با سلسلۂ زلفِ پریشاں آیا!!

کج کلاہی کا سروبرگ مبارک اے جوشؔ
لے پیامِ شکنِ طرۂ جاناں آیا!

برہم اے سلسلۂ زلفِ پریشاں ہو جا
رنگِ طرفِ چمن و ابرِ بیاباں ہو جا

کارواں سست قدم، اور بیاباں درپیش
جرسِ قافلۂ بے سروساماں ہو جا

تجھ کو لبِ تشنگیٔ اہلِ وفا کی سوگند
اے لبِ عطر فشاں! چشمۂ حیواں ہو جا

اے مرے سروِ سہی! موجِ نسیمِ سحری!
فتنۂ گلشن و آشوبِ نیستاں ہو جا!

کثرتِ زخم سے اک باغ ہے قلبِ انساں!
تجھ کو اس باغ کی سوگند گلستاں ہو جا!

وقت ہے، وقتِ گل افشانیٔ و گل ریزی کا
آج گلشن بکف و خلد بداماں ہو جا

اپنی رفتار پہ ہے کوثر و تسنیم کو ناز!
کاکلیں چھوڑ کے شانوں پہ، خراماں ہو جا

جوشؔ آیا ہے گلستاں میں پئے رامش و رنگ
اے کلی! پھول بن، اے پھول گلستاں ہو جا

گزر رہا ہے اِدھر سے تو مسکراتا جا
چراغِ مجلسِ روحانیاں جلاتا جا

اُٹھا کے ناز سے شب آفریں نگاہوں کو
کسی کی سوئی ہوئی روح کو جگاتا جا

نگاہِ مہر سے اے آفتابِ عالمِ پاک
حقیر خاک کے ذرّوں کو جگمگاتا جا

ملا کے مجھ سے نظر، عزّتِ جنوں کی قسم
چراغِ محفلِ عقل و خرد بجھاتا جا!

اسیر کر کے سیہ کاکلوں کے حلقے میں
کمندِ عقلِ تنک مایہ سے چھڑاتا جا

اُٹھا کے عارضِ گلگوں سے ذرا نقاب تو
نظر سے ارض و سما کا حجاب اٹھاتا جا!

مزاج پوچھ کے اے شاہِ علم و کاکل
گدائے راہ کی بھی آبرو بڑھاتا جا

اگر یہ لطف گوارا نہیں تو مستِ خرام!
جبینِ جوشؔ پہ ٹھوکر ہی اک لگاتا جا!

ارض و سما کو ساغر و پیمانہ کر دیا
رندوں نے کائنات کو میخانہ[۱] کر دیا

اے حسن! داد دے کہ تمنائے عشق نے
تیری حیا کو عشوۂ ترکانہ کر دیا!

قرباں ترے کہ اک نگہ التفات نے
دل کی جھجک کو جرأتِ رندانہ کر دیا

صد شکر درسِ حکمتِ ناحق شناس کو
ہم نے رہینِ نعرۂ مستانہ کر دیا

دنیا نے ہر فسانہ "حقیقت" بنا دیا
ہم نے حقیقتوں کو بھی "افسانہ" کر دیا

آواز دو کہ جنسِ دو عالم کو جوشؔ نے
قربانِ یک تبسمِ جانانہ کر دیا ! !

[۱] بعض بعض مقامات پر ردیف "کر دیا" کو "بنا دیا" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ میں اپنے آپ کو ان بے جا قیود کا پابند نہیں سمجھتا۔ جوشؔ

ملجا دین و دلِ عشق ہوں، ایمانِ تمنّا
اترا ہے مری لوح پہ قرآنِ تمنّا

کیوں کر نہ کرے دعوئے پیغمبریٔ عشق!
حاصل ہو جسے دولتِ عرفانِ تمنّا

ہنستا ہوا گزرا ہوں میں طوفانِ اجل سے
سینے میں لیے چشمۂ حیوانِ تمنّا!

اک حرف بھی دھویا نہ گیا وقت سے اب تک
کیا پان ہے اے کاتبِ دیوانِ تمنّا

صرف ایک شکن میں ہے نہاں عرصۂ کونین
اللہ ری اے وسعتِ دامانِ تمنّا!

جو باعثِ ایجاد ہے، اس ذات کی سوگند
ناقابلِ تسلیم ہے پایانِ تمنّا!!

جب تک کہ محبت کی ہے دنیا کو ضرورت
دستِ منِ دیوانہ و دامانِ تمنّا!

ہر شب مری سرکار میں آتے ہیں فرشتے
ہاتھوں پہ لیے شمعِ فروزانِ تمنّا

کونین کے سینے میں تلاطم سا بپا ہے
اللہ ری یہ گہر افشانیٔ مژگانِ تمنّا

ہاں پھیر ادھر بھی کہ ہو تازہ مرا ایمان
یہ روئے کتابی کہ ہے قرآنِ تمنّا

ممکن ہو تو صرف ایک نظر حالِ گدا پر
اے شاہِ دل عالم و سلطانِ تمنّا

اِک جوشش کا دِل ہی نہیں، خود گوئے دو عالم
غلطیدہ ہے پیشِ خمِ چوگانِ تمنّا!

جب دل نے مجھ کو شعلہ بداماں بنا دیا
میں نے ہر ایک خار کو بُستاں بنا دیا

اِس پچھلی رات کو جسے کہتے ہیں کم سِنی!
میری نظر نے صبح درخشاں بنا دیا

اے حُسن! شاد ہو کہ تجھے جنبشِ شوق نے
آشوبِ خلق و فتنۂ دوراں بنا دیا!

پنہاں تھیں جس میں رُوح کی گہری خموشیاں
اِس جنبشِ نظر کو غزل خواں بنا دیا!

زلفوں کی ہر گرہ کو عطا کی متاعِ دل
ابرو کی ہر شکن کو رگِ جاں بنا دیا

جلووں کو دیں نظامِ دو عالم کی وسعتیں
شوخی کو کائنات بداماں بنا دیا!

غنچوں کی غنچگی کو عطا کی شگفتگی!
شبنم کی بوند کو دُرِ غلطاں بنا دیا

غمزے کے "اشتباہ" کو بخشا "یقینِ ناز"
"وہمِ شرر" کو شعلۂ عریاں بنا دیا

فیضِ نگاہِ عشق نے اے دفترِ جمال!
تیرے ہر ایک جزو کو قرآں بنا دیا

خالِ سیہ کو بخش دے مہرِ پیمبری!
زلفوں کی موجِ کفر کو ایماں بنا دیا

اے ناز! داد دے کہ شرابِ جمال کو
میری نظر نے چشمۂ حیواں بنا دیا

اے حسن! شکر کر کہ ملی تجھ کو خسروی
اے جسمِ ناز کر کہ تجھے جاں بنا دیا

کج کر کلاہِ فخر کہ تیرے شباب کو
میں نے خدائے عالمِ امکاں بنا دیا

لیکن بہ ایں ہمہ ترا احساں ہے جوش پر
دل کو دئے وہ داغ کہ انساں بنا دیا

وفا شعار رہوں ترکِ وفا نہیں کرتا
میں ہمنوازِ مشیوحی قضا نہیں کرتا!

وہ کون عربدہ خو ہے جو میرے دل کے ساتھ
حقوقِ مہر و محبت ادا نہیں کرتا!

وہ کون منظرِ قدرت ہے، آج عالم میں
جو میرے واسطے آغوش وا نہیں کرتا

ہزار بار کیا عہد اس نے مجھ سے وفا
جو ایک بار کبھی وعدہ وفا نہیں کرتا

خدا کرے کبھی رندوں کے سامنے آئے
فقیہہ شہر کہ ترکِ ریا نہیں کرتا!

جزائے خیر کا اس بیخودی پہ طالب ہوں
کہ میں تصوّرِ یومِ جزا نہیں کرتا!

ہزار بار کیا عہد ترکِ صہبا کا!
مگر تبسمِ ساقی خطا نہیں کرتا!

گماں تو جوشش یہی ہے کہ ہے گدا ناقص
نہ یہ کہ شاہ، خیالِ گدا نہیں کرتا

اگر گیسو بدوش آتا نہیں، اچھا یونہیں آجا
کسی دن تیغ بردست و کفن در آستیں آجا

حرم ہو، مدرسہ ہو، دیر ہو، مسجد کہ مے خانہ
یہاں تو صرف جلوے کی تمنا ہے کہیں آجا

سرِ راہِ طلب ہر گام ہے اک منزلِ تلخی!
کبھی اِن تلخیوں میں مثلِ موجِ انگبیں آجا

بڑے دعوے ہیں اہلِ انجمن کو صبر و تمکیں کے
کبھی جلوت میں بھی اے فتنۂ خلوت نشیں آجا

اذانیں ابر پیما ہیں، تو سجدے آسماں فرسا
ذرا مسجد میں بھی اے دشمنِ ایمان و دیں آجا

چلا ہے سوئے حرم، دل سے ساز کرتا جا
طواف کعبۂ حسنِ مجاز کرتا جا!
ملے جو وقت تو اے رہروِ رہِ اکسیر
حقیر خاک سے بھی ساز باز کرتا جا

فراغِ رازِ مسرت کے ڈھونڈنے والے
شبیوں کو محرمِ سوز و گداز کرتا جا
بلند و پست وہاں کے، اے معاذاللہ
یہیں سے سیرِ نشیب و فراز کرتا جا

تلاشِ جادۂ بے پیچ و خم سے قبل اے دوست
تجسسِ خمِ زلفِ دراز کرتا جا!
اگر جبیں کو ہے ذوقِ حریم بے رنگی!
بساطِ رنگ پہ مشقِ نماز کرتا جا

چلا ہے خدمتِ یارِ درست پیماں میں
پرستشِ صنمِ حیلہ ساز کرتا جا
وہاں جمال کو فرصت نہیں توقف کی
یہیں سے دیدۂ باطن کو باز کرتا جا
مثالِ جوش اسی آب و گل کے عالم سے
نظر کو خوگرِ طغیانِ ناز کرتا جا

نہ جانے رات کو کیا میکدے میں مشغلہ تھا
کہ ہر نفس میں قیامت کا جوش و ولولہ تھا

نگاہ یار کی یوں اٹھ رہی تھی جھک جھک کر
زمیں رقص میں تھی آسماں پہ زلزلہ تھا

لرز رہے تھے شگوفے، تڑپ رہے تھے نجوم
چھڑا ہوا نہیں معلوم کون مسئلہ تھا

کبھی ہلال چمکتا تھا، اور کبھی خنجر
میانِ عشق و جوانی عجیب مرحلہ تھا

تپاں تھا دائرۂ خاک و عالمِ ارواح
نیاز و ناز میں جانے کیا معاملہ تھا

زباں پر آئیں تو ہر حرف سے لہو ٹپکے
ہر ایک سانس میں ان ولولوں کا قافلہ تھا

دل و نگار میں تھی کچھ لطیف و گفت و شنود
نہ جانے شکرِ کرم تھا کہ شکوہ و گلہ تھا

اُدھر تھی لرزشِ صہبا، اِدھر خرامِ نگار
نیا لی بحث چھڑی تھی، نیا مقابلہ تھا

بساطِ خاک سے تا اوجِ ثابت و سیار
شمیم کاکلِ عنبر فشاں کا سلسلہ تھا

ترانہ ریز تھی نبضِ حیات کی جنبش!
ضمیرِ شب میں وہ پنہاں خروش و ولولہ تھا

سزا، ارہ شفتہ ذرا بھی کمی نہ کی اے جوش!
اگرچہ دیکھنے میں یار تنگ حوصلہ تھا!

دورِ بینی و جوانی، یہ تماشا کیسا؟!
عیشِ امروز کے طوفان میں فردا کیسا؟
اس زمانہ میں کہ ہو جامہ دریٔ جیبِ ایماں
راہ میں خار سے دامن کا بچانا کیسا؟

مہ وشوں کے نفسِ عطر فشاں کے ہوتے
ذکرِ جاں بخشیٔ انفاسِ مسیحا کیسا؟
سر پہ جس وقت گرجتے ہوں جنوں کے بادل
پختہ کاری کی صدا، عقل کا غوغا کیسا؟

رامش و رنگ کی گونجی ہوئی آوازوں میں
قصۂ جنت و افسانۂ عقبیٰ کیسا؟!
اس زمانہ میں کہ ہر ذرہ ہو جب جاذبِ دل
نرگسِ ناز کے دھوکے میں نہ آنا کیسا؟

ہوں جہاں قلقلِ مینا سے ترانے ہم دوش
اس جگہ کوثر و تسنیم کا چرچا کیسا؟
جس شبِ ماہ میں ہو بربط و فرشِ سنجاب
اس شبِ ماہ میں تسبیح و مصلے

جوشؔ باغی ہے مشیت کا جوانِ صالح!
موسمِ کفر میں اسلام کا دعویٰ کیسا؟

پھر تابِ رُخ سے ذوقِ نظر بہرہ ور ہے آج
پھر ہر نگاہ، مرہمِ زخمِ جگر ہے آج!

پھر سینۂ زمیں سے اُبلتا ہے سیم و زر
پھر آسماں سے بارشِ لعل و گہر ہے آج

پہلوئے شوق میں ہے سرِ پاکِ آرزو!
پھر جوششِ انبساط سے پاکیزہ تر ہے آج

آنکھوں کے پردہ ہائے سبک میں ہے عکسِ رُخ
دریا کی نرم سطح پر رقصِ قمر ہے آج

پھر دل صدائے چنگ سے ہے گرمِ اختلاط
پھر روح موجِ نغمہ سے شیر و شکر ہے آج

پھر دیدۂ نیاز میں غلطاں ہے عکسِ ناز
پھر بزمِ حُسن میں برقِ تپاں جلوہ گر ہے آج

پھر یوں جبینِ ناز پہ بکھری ہیں کاکلیں!
تو یہ کہے کہ ابر محیطِ قمر ہے آج

پھر بج رہا ہے محفلِ عشرت میں دائرہ
پھر اشکِ گرم، حلقۂ بیرونِ در ہے آج

پھر سر پہ تیرہ ابر کی رو ہے بطرزِ نو!
پھر دل میں رقصِ درد برنگِ دگر ہے آج

سینے میں چھڑ رہی ہے پھر آوازِ پائے یار!
دل پھر خرامِ ناز سے زیر و زبر ہے آج

پھر حسن کی جھلک سے جھپکتی نہیں نظر!
پھر سازگارِ شمع کو نورِ سحر ہے آج

پھر سُن رہا ہے کوئی بصد قدر کلامِ جوشؔ
پھر عرش بر دماغ متاعِ ہنر ہے آج

ادھر بھی بادِ صبا! آ بہار کی سوگند
شمیمِ طرۂ گیسوئے یار کی سوگند

چھڑا دو رنگیٔ امید و بیم سے دل کو!
طلسمِ گردشِ لیل و نہار کی سوگند

میرے دماغ پہ بھی ڈال پرتوِ محبوب
تجھے شعاعِ سحر و بہار کی سوگند

سکھا جمال کو ایفائے عہد کا دستور
جفائے طولِ شبِ انتظار کی سوگند

جلا دے حسن کے سینے میں آرزو کا چراغ
ضمیرِ سنگ میں سوزِ شرار کی سوگند

دلِ فسردہ کو رنگینیوں سے کر سرشار
گلِ شگفتہ کے نقش و نگار کی سوگند

وفا کے دکھتے ہوئے پہلوؤں کو دے آرام
کنارِ یار و لبِ جوئبار کی سوگند

سنا فسانۂ رفتارِ دل فروز نگار
جواں خرامیٔ ابرِ بہار کی سوگند

بتا بکھرتی ہے کس طرح زلف شانوں پر ؟
نزولِ رحمتِ پروردگار کی سوگند
ٹھہر ٹھہر کے سنا داستانِ عشوہ و ناز
نزاکتِ دلِ اُمیدوار کی سوگند
سنا دے جوشؔ کو بھی نغمہائے لعلِ نگار
خروشِ آمدِ فصلِ بہار کی سوگند

آ، اور جہاں کو غرقِ لبِ نوش خند کر — آوازۂ فسونِ جوانی بلند کر!
جھکی ابروؤں پہ ڈالکے زلفوں کو کھولیے — کونین کو اسیرِ کمان و کمند کر!
سنتا ہوں دردِ عشق ہے ہر درد کی دوا — آ، اور میرے دردِ جگر کو دوچند کر
آشفتہ خُو طبیب ہے، نازک مزاج دل — کیونکر کہوں علاجِ دلِ دردمند کر
گیتی کو خلفشار ہے، گردوں کو اضطراب — محوِ خرامِ ناز! درِ فتنہ بند کر!
اے خواجہ! زندگی میں اسیری ہے ناگزیر — دل کو اسیرِ کاکلِ مشکیں کمند کر!
آیا ہے جوشؔ تحفۂ داغِ جگر لئے
مرضی تری پسند نہ کر یا پسند کر!

اٹھی وہ گھٹا، زنگ سامانیاں کر! — گہر پاشیاں کر، زر افشانیاں کر
وہ چہکے عنادل، وہ سنکیں ہوائیں — گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر!
صراحی جھکا، اور دھومیں مچا دے — گلابی اٹھا، اور گل افشانیاں کر!

مٹا داغِ ہوش اور مدہوش بن جا — اٹھا جامِ زر، اور سلطانیاں کر!
نگاہوں سے برسا دے ابرِ جوانی — مئے لالہ گوں سے گلستانیاں کر!
سمندر پہ چل، اور الیاس بن جا — ہواؤں پہ اُڑ، اور سلیمانیاں کر!
صبا کی طرح کنج میں رقص فرما! — بگولوں کے مانند جولانیاں کر!
سکوں پاؤں چومے وہ ہلچل مچا دے — خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر!
عَلم کھول کر جوشِ بدمستیوں کے
جہاں داریاں کر، جہاں بانیاں کر!

شیخ اور خلشِ بندگیٔ و زحمتِ پرہیز
ہیں اور مئے دیرینۂ و معشوقۂ نوخیز
اللہ رے اس دشمنِ راحت کا تلوّن!
گلبانگ اماں ہے، تو کبھی شورشِ چنگیز!
کہسار میں تیشے کی صدا گونج رہی ہے
افسوس ہے اے زمزمۂ عشرتِ پرویز
اللہ ری اس فتنۂ دوراں کی جوانی!
خوں ریز و شرر ریز و جنوں خیز و دل آویز
اے گیسوئے شب رنگ! وہی نکہتِ فردوس
اے نرگسِ مخمور! وہی ساغرِ لبریز!
رقصاں رخِ محبوب میں ہے صبح کی خنکی
بیدار ابھی ہو خواب سے اے جوششِ سحر خیز

میں قرباں اے مرے ترکِ قبا پوش
کبھی آ اس طرف بھی زلف بر دوش

نگارِ خوش خرام و یارِ شیریں!
بتِ آشوبِ عقل و فتنۂ ہوش

ہنوز اے شہریارِ کشورِ دل
گدائے راہ کا خالی ہے آغوش!

کسی دن تو بن اے جانِ خرابات
انیسِ خلوتِ رندانِ مے نوش

کہوں کس طرح دامن پارہ پارہ
کدھر ہے اے مری سلمائے گل پوش

کبھی تو سامنے آ، جام بر کف
بہ رغمِ زاہدانِ خرقہ بر دوش!

وہ گونجا نغمۂ شیرینِ جاناں!
زمین و آسماں، خاموش، خاموش

وہ دستک دی ترے در پر کسی نے
بجا لا سجدۂ شکرانہ اے جوش

مبارک دیدۂ حیراں مبارک!
بہشتِ جلوۂ جاناں مبارک

شبِ تاریک کی خاموشیوں کو
خروشِ مرغِ خوش الحاں مبارک

وفورِ غم کو عشرت کی بشارت
ہجومِ درد کو درماں مبارک

خمِ محرابِ چشمِ آرزو کو! — چراغِ چہرۂ خنداں مبارک

نگاہِ رہروِ راہِ طرب کو! — سوادِ کوچۂ جاناں مبارک

ہوائے شامِ غم کی گرمیوں کو — نسیمِ صبحِ گل افشاں مبارک

لبِ اُمید کو موجِ تبسّم — بہ یُمنِ دیدۂ گریاں مبارک

گدائے رہ نشینِ بے نوا کو! — غرورِ صحبتِ سلطاں مبارک

ہوائے بخیۂ زخمِ جگر کو — ادائے جنبشِ مژگاں مبارک

جنابِ جوشؔ کو یہ کامرانی!
بہ فیضِ قربِ درویشاں مبارک

پھر مہرباں وہ خسروِ خوباں ہے آجکل
پھر دستِ شوق و دامنِ جاناں ہے آجکل

پھر اعتقادِ عالمِ بالا ہے ان دنوں!
پھر اعتبارِ گردشِ دوراں ہے آجکل

پھر زلفِ ناز و روئے درخشاں ہیں دام میں
پھر جنسِ ابر و صاعقہ ارزاں ہے آجکل

ہر ذرۂ حقیر ہے فردوسِ رنگ و بُو
ہر دشتِ بے گیاہ گلستاں ہے آج کل

موجِ شمیم کاکلِ جاناں کے فیض سے
پھر بازوؤں پہ دولتِ بستاں ہے آجکل

شکرِ خدا کہ بُرّشِ شمشیرِ روزگار!
پھر مرہمِ جراحتِ پنہاں ہے آج کل

ہر فکر ، بجز ہے فکر الٰہی سے ہم عناں !
ہر عزم پھر ارادۂ یزداں ہے آجکل

کیا چیز مل گئی ہے کہ میری نگاہ میں !
ہر تاجدار بے سر و ساماں ہے آج کل

پھر جوشِ بزمِ عیش میں ہر موجۂ نفس
عمرِ مسیح و خضر پہ خنداں ہے آج کل !

پھر ابرِ تیرہ اٹھا ، پھر چلی نسیمِ شمال
کدھر ہے ساقیِ جادو نگاہ و زہرہ جمال

برس رہی ہے خنک ابر سے جواں بخشی
کھلا ہوا ہے گلستاں میں پرچمِ اقبال

مچل رہی ہے بلندی پہ موجِ آبِ بقا
دمک رہی ہے گلابی میں آتشِ سیال

فلک کے بام پہ ہے رقصِ نغمۂ عشرت
زمیں کے دوش پہ ہے مژدۂ زمانِ وصال

فضا ہے پرتوِ ابرِ سیہ سے رنگا رنگ
صبا ہے دولتِ بوئے چمن سے مالا مال

کہو کہ آئے سوئے صحنِ باغ تیغ بکف
وہ جس کے واسطے ہے خونِ کائنات حلال

وہ جوش سوئے چمن جھومتا ہوا آیا !
اٹھو اے زمان و مکاں ، اٹھو برائے استقبال

زلفِ شکیب و صبر پریشاں ہے آج کل
پھر اضطراب سلسلۂ جنباں ہے آج کل

پھر عاشقی کے رُو بہ ترقی کے ہیں ولولے
پھر سعیِ عقل سر بگریباں ہے آج کل

محرابِ اضطراب میں پھر مطربِ جنوں
اُلجھی دھنوں کے ساتھ غزل خواں ہے آج کل

پھر بُوئے گُل ہے دُشنۂ سر تیزانِ دلتوں
پھر بادِ صبح، شعلۂ عریاں ہے آج کل

پھر آرزوئے شرکتِ بزمِ جمال ہے
پھر اہتمامِ خدمتِ درباں ہے آج کل

پھر قوتِ دلیل ہے ڈالے ہوئے سپر
منسوخ پھر شریعتِ برہاں ہے آج کل

وہ سجدہ جس کے واسطے فرشِ حرم ہے تنگ
پھر آستانِ یار میں غلطاں ہے آج کل

اللہ رے گدازِ محبّت کے معجزے
کافر تھا جو دماغ مسلماں ہے آج کل

پھر عزمِ صبر، بحرِ ندامت میں غرق ہے
پھر وضعِ احتیاط، پشیماں ہے آج کل

پھر اس دل و دماغ کا جوہر لطیف
وابستۂ تصوّرِ جاناں ہے آج کل!

اے ہم نشیں! دماغ کی ژولیدگی نہ پوچھ
گویا زمیں، ہواؤں پہ غلطاں ہے آج کل

وہ جاں، جس پہ مایۂ کون و مکاں نثار
پھر نذرِ یک تبسمِ جاناں ہے آج کل

وہ خونِ دل، کہ جنسِ دو عالم سے ہے گراں
بازارِ اضطراب میں ارزاں ہے آج کل!

جمتا نہیں تصورِ جاناں پہ بھی خیال!
بے چینیوں کا دل میں وہ طوفاں ہے آج کل

نیرِ نگاہِ نرگسِ جاناں کے فیض سے!
پھر جوشِ شرحِ صدر کا ساماں ہے آج کل

پھر آشنائے لذتِ دردِ جگر ہیں ہم
پھر محرمِ کشاکشِ ہر خیر و شر ہیں ہم!

ہر سانس دے رہی ہے خبر کائنات کی!
پھر بادۂ جمال سے یوں بے خبر ہیں ہم!

پھر عشق کی نظر میں ہے معشوقیت کا راز
پھر حسنِ دل نواز سے شیر و شکر ہیں ہم

جینے کے اشتیاق سے ہے پھر رمیدگی!
پھر سینۂ حیات میں عزمِ سفر ہیں ہم!

ہشیار باش، ظلمتِ غم خانۂ حیات
پھر مرکزِ تجلیِ شمس و قمر ہیں ہم!

کس زعم میں ہے اے شبِ دیجورِ زندگی ؟
پھر راز دارِ نورِ طلوعِ سحر ہیں ہم !!

ہے کس خیالِ خام میں اے خارزارِ دہر ؟
پھر کامرانِ خندۂ گلہائے تر ہیں ہم !

پھر زندگی ہے غم کی امانت لئے ہوئے !!
ہر دولتِ نشاط سے پھر بہرہ ور ہیں ہم !!

پھر فیضِ عاشقی سے بہ ایں بے بضاعتی
جیبِ جہاں میں دولتِ لعل و گہر ہیں ہم

پھر باوجودِ فقر وہ حاصل ہے طمطراق !
تو یہ کہے کہ صاحبِ تاج و کمر ہیں ہم !

آنکھوں میں نورِ مصحفِ جاناں لئے ہوئے
پھر گرد کارِ عشق کے پیغامبر ہیں ہم

کھلتے نہیں ہیں جوشؔ، دماغوں پہ دل کے راز
بالا تر از رسائیِ فکر و نظر ہیں ہم

پھر سر کسی کے در پہ جھکائے ہوئے ہیں ہم
پردے پھر آسماں کے اٹھائے ہوئے ہیں ہم

چھائی ہوئی ہے عشق کی پھر دل پہ بیخودی
پھر زندگی کو ہوش میں لائے ہوئے ہیں ہم

جس کا ہر ایک جزو ہے اکسیرِ زندگی !
پھر خاک میں وہ جنس ملائے ہوئے ہیں ہم !!

بالا ہیں جوش، دامِ زمان و مکاں سے ہم
رسمِ تعیّنات کو لائیں کہاں سے ہم

کوثر کی آرزو وہیں رہیں گے نہ تشنہ کام
پیماں یہ کر چکے ہیں مئے ارغواں سے ہم

اے حسنِ لازوال! قسم تیرے ناز کی
بیگانہ ہو چکے ہیں بہار و خزاں سے ہم

انمول بننے والے ہیں جس چیز سے کبھی
ارزاں ہیں آجکل اُسی جنسِ گراں سے ہم

اب اے خدا! عنایت بیجا سے فائدہ؟
مانوس ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم

روز اک نئی زمیں سے گزرتے ہیں ہر نفس
ملتے ہوئے ہیں موجۂ آبِ رواں سے ہم

کیا کہہ رہے ہو دُور رہے اربابِ کیف و کم
باہر کھڑے ہیں حلقۂ سُود و زیاں سے ہم

یہ طُرفہ بات ہے کہ بایں فقر و بے زری
ہیں بہرہ یاب دولتِ کون و مکاں سے ہم

جب حُسن چاہے عشق کے سانچے میں ڈھالے
بکھرے ہوئے ہیں آتشِ رطلِ گراں سے ہم

ہاں کون پوچھتا ہے خوشی کا نہفتہ راز؟
پھر غم کا بارِ دل پہ اٹھائے ہوئے ہیں ہم
ہاں کون درسِ عشق و جنوں کا ہے خواستگار
آئے کہ ہر سبق کو بھلائے ہوئے ہیں ہم!
آئے جسے ہو جادۂ رفعت کی آرزو!
پھر سر کسی کے در پہ جھکائے ہوئے ہیں ہم
بیعت کو آئے جس کو تحقیق کا خیال!
کون و مکاں کے راز کو پائے ہوئے ہیں ہم
ہستی کے دامِ سخن سے اکتا گیا ہے کون؟
کہہ دو کہ پھر گرفت میں آئے ہوئے ہیں ہم
ہاں کس کے پائے دل میں ہے زنجیر آب و گل؟
کہہ دو کہ دامِ زلف میں آئے ہوئے ہیں ہم
ہاں کس کو جستجو ہے نسیمِ فراغ کی؟
آسودگی کو آگ لگائے ہوئے ہیں ہم!
ہاں کس کو سیرِ ارض و سما کا ہے اشتیاق؟
دھونی پھر اس گلی میں رمائے ہوئے ہیں ہم
جس پر نثار کون و مکاں کی حقیقتیں!!
پھر جوشؔ اس فریب میں آئے ہوئے ہیں ہم

دوستو! وقت ہے، پھر زخمِ جگر تازہ کریں
پردہ جنبش میں ہے، پھر آؤ نظر تازہ کریں

تا کجا نالۂ غربت، کہ چلی بادِ شمال
دل میں پھر زمزمۂ عزمِ سفر تازہ کریں

آؤ، پھر دھوم سے ہو آج غروب اور طلوع
سنتِ بندگیٔ شمس و قمر تازہ کریں

آؤ چل کر رُخِ ناشستہ کو دیکھیں دمِ صبح
موجِ رنگِ افق و نورِ سحر تازہ کریں

کُلّۂ فقر کو کج کر کے سرِ بزمِ نشاط
آؤ رسمِ کہنِ تاج و کمر تازہ کریں

آؤ پھر جلوۂ جاناں پہ لٹا دیں کونین
شغلِ پارینۂ اربابِ نظر تازہ کریں

طبقِ زر میں لگا کر پئے نذرِ جاناں
آؤ پھر آبروئے لعل و گہر تازہ کریں

آؤ پھر جوش کو دے کر لقبِ شاہِ سخن
دلِ دینِ سخن و جانِ ہنر تازہ کریں

اہلِ زمیں! غریب ہیں ہم، نکتہ چیں نہ ہو
آتے ہیں گاہ گاہ یہاں آسماں سے ہم!

ہر نقشِ پا میں لوٹ رہی ہیں جوانیاں
یوں آ رہے ہیں خدمتِ پیرِ مغاں سے ہم

جنگل ہے، آب جو ہے، شبِ ماہتاب ہے
ایسے میں ان کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم

ہاں آسماں! اپنی بلندی سے ہوشیار
لے سر اٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

اٹھنا تھا جن کو چین و عجم سے، سو اٹھ چکے
اب جوشؔ اٹھے ہیں کشورِ ہندوستاں سے ہم

نہ جادو، نہ افسوں گری چاہتا ہوں
فقط حسن سے دلبری چاہتا ہوں

حضوری مجھے پر رعب دربار میں بھی
دلِ تند و شوقِ جری چاہتا ہوں

مری جنس کے ہاتھ بک جائے خود ہی
میں وہ قدرداں مشتری چاہتا ہوں

اہانت گوارا نہیں عاشقی کی!
غلامی میں بھی سروری چاہتا ہوں

مزاجِ تمنائے خود دار تو دیکھ!
عبادت میں بھی داوری چاہتا ہوں

مگر ہے اگر دلبری "داوری" پر!
کم از کم میں پیغمبری چاہتا ہوں

جو پیغمبری میں بھی دشواریاں ہوں
تو ہنگامۂ کافری چاہتا ہوں!

خلاصہ ہے یہ جوشؔ اس داستاں کا
کہ جوہر ہوں اور جوہری چاہتا ہوں

مری مجال، تیری بزم، اور لن ترانیاں!
میں نقشِ پائے رہرواں، تو افسرِ جہانیاں!
سخن فروشیاں نہ کر جہانِ حسن و عشق میں
کہ یاں ہر ایک حال میں ہیں لاکھ نکتہ دانیاں
وہ زیبِ انجمن ہوا تو کوئی بولتا نہیں
معاشرانِ بزم کیا ہوئیں وہ گل فشانیاں؟
ذرا اثر نہ پڑ سکا جنونِ ذوقِ دید پر!
پیمبروں نے لاکھ کیں نظر کی پاسبانیاں
شدید بدگمانیوں پہ تحسینِ ظن ہے بار سے
عمیق محسنِ ظن میں ہیں ہزار بدگمانیاں
عجیب طرفہ راز ہیں، مری شبوں کے راز بھی
جنہیں نہاں کئے ہوئے ہیں سینکڑوں جوانیاں
شبابِ رفتہ کے قدم کی چاپ سن رہا ہوں میں
ندیم! عہدِ شوق کی سنائیے جا کہانیاں
مری بساطِ مے کشی پہ جوش سجدہ ریز ہیں
کروڑ قہرمانیاں، ہزار ہا کہانیاں

اُٹھ کہ تعمیرِ حیاتِ گزراں کچھ بھی نہیں
جز مئے ناب، ثمرِ برگِ جہاں کچھ بھی نہیں
آہ کہ یہ وسوسۂ ارض و سما ہے بیکار
اٹھ کہ یہ دہمہٴ سود و زیاں کچھ بھی نہیں

وہ سہی قد، لبِ ساحل جو نہ ہو گرمِ خرام
قامتِ سرو و خمِ آبِ رواں کچھ بھی نہیں

جام اٹھا جام، کہ سرشاری و مستی کے بغیر
خندۂ حور و تماشائے جناں کچھ بھی نہیں

پرتوِ چشمِ فسوں خیز برہمن کے سوا
نقشِ رنگینیٔ رخسارِ بتاں کچھ بھی نہیں

فیض اٹھا حسنِ جوانانِ چمن سے کہ ندیم
عالمِ پیری و عجز و ہم و گماں کچھ بھی نہیں

اس کے نزدیک سمجھتا ہو جو اسرارِ بہار
خوفِ گلچیں و غمِ بادِ خزاں کچھ بھی نہیں

جز غمِ عشق، غمِ کون و مکاں بے بنیاد
جز دلِ شاد، متاعِ دو جہاں کچھ بھی نہیں

ایک ذرّہ بھی ہو محسوس تو سب کچھ ہے وہی
ہو نہ محسوس تو خلاّقِ جہاں کچھ بھی نہیں

مرضِ زیست کا اے جوشؔ زمانے میں علاج
جز مئے کہنہ و معشوقِ جواں کچھ بھی نہیں

وقت سحر ہے آؤ حریفو! وضو کریں
مینا اٹھائیں، خدمتِ جام و سبو کریں

لو کھل گیا وہ پرچمِ خورشید زرنگار
اٹھو کہ وا دریچۂ صد رنگ و بو کریں

طائر خروش میں ہیں، صبا گرمِ اختلاط
آؤ حریمِ کیف میں پھر ہائے ہو کریں

مستانہ وار، جیبِ جوانی کے چاک میں
پھر رشتۂ شرابِ کہن سے رفو کریں

پھر رفتۂ خوش نگار کی دہرائیں داستاں
حسن و جمالِ یار کی پھر گفتگو کریں!

مایوسِ زندگانی و رغبتِ حیات کو
صہبا کی نرم آنچ سے پھر شست و شو کریں

آؤ بنائیں یار کو پھر صدرِ انجمن
آئینہ آفتاب کے پھر روبرو کریں

دنیا کو، آؤ، رشکِ بہشتِ بریں کریں
خشکی کو، آؤ، رود کشِ صد آبجو کریں

لیلائے کیفِ دوش کا مرجھا چلا ہے ہار
پھر تازہ پھول گوندھ کے زیبِ گلو کریں۔

آنے لگی ہے دیر سے ناقوس کی صدا
آؤ، تصورِ صنمِ سادہ رو کریں

بہرِ دعا زمانہ اٹھائے ہوئے ہے ہات
بڑھو، اٹھو کہ بیعتِ دستِ سبو کریں

پھر آؤ، دل کا جوش کے نغموں سے درس لیں
پھر آؤ، تازہ رسم و رہِ آرزو کریں

آپ بھی آئیں، کہ ہے دیر سے گرمِ تگ و دو
لرزشِ بادۂ دیرینہ و عکسِ مہِ نو

دفعتِ دیدار مچل جاتے ہیں ارماں جیسے
یوں ہے ہلچل میں لبِ آبِ رواں شمع کی لَو

کر دئیں روح میں جس طور سے لے یادِ حبیب
جام میں چاند کا یوں کانپ رہا ہے پرتو

سینۂ شب میں تصور ہے سحر کا غلطاں
یا ہے جنگل میں گھنی چھاؤں میں مہتاب نَسو

دل ہی دل میں کوئی معشوق سے ہے گرمِ سخن
ساز بردوش ہے یا بادِ خوش آہنگ کی رَو

پتا پتا ہے مثالِ لبِ لعلِ سلمیٰ
ریشہ ریشہ ہے جوابِ کرِ کیخسرو

دفن ہے ساز میں افسردگیِ ماضی و حال
غرق ہے رطلِ گراں میں غمِ دیرینہ و نو

تم بھی اس بزم میں ہو چند نفس عشوہ فروش
کہ پڑے چہرۂ رخ پہ کبھی صحنِ زمیں سے پرتو!

آ کہ پھر آج ہم آہنگ ہوئی ہے لبِ جو
نے کی لَے، چاندنی، تو، نیز صبا کی خوشبو

منعقد پھر سے کریں محفلِ جمشید و قباد
دو گھڑی ہی صدر نشینی پہ جو آمادہ ہو تو

وقت گم جو دلِ یزداں میں ہوا تھا غلطاں
تیرے دل میں کبھی وہی آ کے جگا دے جادو
کفر سجدے میں گرے، دین کی نبضیں چھوٹ جائیں
آج آ دوش پہ بکھرائے ہوئے یوں گیسو
میں ہوں وہ رند جسے دیکھ کے کہتے ہیں ملک
آفریں باد بر ایں خلوتیٔ جام و سبو
عقل کہتی ہے کہ کس طرح میسّر ہوگا
عشق کہتا ہے کہ فردوس ہے تیرا پہلو
کیف ہستی میں گہر بار گراں آنکھوں کو
غم ہستی سے ٹپکتے نہیں جن کے آنسو
آپلا پھر مئے اسرار سکون و جنبش
اے بہ تمکیں حرم قدس در شوخی آہو
آج یوں دل میں حفاظت سے ہیں ارمان بچیں
جیسے طاعت میں بدلتے ہیں فرشتے پہلو
خاک مست، آب رواں تند ہوائیں سرشار
آج اپنے یہ عناصر کو نہیں ہے قابو
آج اے نور نگاہ قمر و بنت سحاب
کاش میرا سر شوریدہ ہو تیرا زانو
پرسشِ چند نفس اے مرے سرمایۂ شوق
زحمتِ چند قدم، اے مرے سرو لبِ جو!
آج اے جوش ترے رنگ غزل گوئی سے
قندِ پارس کا مزا ہے بزبانِ اردو

نہ جانے رات کو تھا کون زینتِ پہلو
مچل رہی تھی ہوا میں شراب کی خوشبو

حریمِ صلح میں قائم تھا ایک مرکز پر
مزاجِ عشق و تقاضائے حسنِ عربدہ جُو

وفا کی انجمنِ شوق میں تھی شیر و شکر
جراحتِ دلِ صد چاک و تیغِ صاعقہ خُو

مٹا چکا تھا فلک رسمِ ساغر و سنداں
بھلا چکا تھا زمانہ نزاعِ سنگ و سبو

ہوا کی جیب میں تھا تیر از کماں رفتہ
کشش کے دام میں تھی کاوشِ رمِ آہو

بساطِ خاک پہ خوابیدہ تھا غمِ دوراں
شرابِ تند کی لہروں میں غرق تھے آنسو

اُدھر محیطِ فلک پر فسونِ نجم و قمر
اِدھر حریمِ تمنا میں نرگسِ جادو

اُدھر حیات کی لحنِ طرب تھی تا بہ فلک
ادھر شباب کی موجِ رواں تھی تا بہ گلو

اُدھر اُڑا ہوا طولِ شبِ فراق کا رنگ
ادھر شباب پہ آرائشِ خمِ گیسو

چھڑی ہوئی ہے حکایت شبِ جوانی میں
تڑپ کے جوش! پھر اک بار نعرۂ یاہو

فکر ہی ٹھہری تو دل کو فکرِ خوباں کیوں نہو؟
خاک ہونا ہے تو خاکِ کوئے جاناں کیوں نہو؟

دہر میں، اے خواجہ! ٹھہری جب اسیری ناگزیر
دل اسیرِ حلقۂ گیسوئے پیچاں کیوں نہ ہو؟

زیست ہے جب مستقل آوارہ گردی ہی کا نام
عقل والو! پھر طوافِ کوئے جاناں کیوں نہو؟

جب نہیں مستوریوں میں بھی گناہوں سے نجات
دل کھلے بندوں غریقِ بحرِ عصیاں کیوں نہ ہو؟

اک نہ اک ہنگامے پر موقوف ہے جب زندگی
میکدے میں رندِ رقصاں و غزلخواں کیوں نہو!

جب خوش و ناخوش کسی کے ہاتھ میں دینا ہی ہاتھ
ہمنشیں! پھر بیعتِ جامِ زر افشاں کیوں نہ ہو؟

جب بشر کی دسترس سے دور ہے "حبل المتیں"
دشتِ وحشت میں پھر اک کافر کا داماں کیوں نہو؟

ایک ہے جب شورِ جہل و بانگِ حکمت کا مآل
دل ہلاکِ ذوقِ گلبانگِ پریشاں کیوں نہو؟

اک نہ اک رفعت کے آگے سجدہ لازم ہے تو پھر
آدمی محوِ سجودِ سرو خوباں کیوں نہ ہو؟

اک نہ اک پھندے ہی میں پھنسنا ہے جب انسان کو
دوش پر دامِ سیاہ سنبلستاں کیوں نہو؟

جب فریبوں ہی میں رہنا ہے تو اے اہلِ خرد
لذّتِ پیمانِ یارِ سست پیماں کیوں نہ ہو؟
یاں جب آویزش ہی ٹھہری ہے تو ذرّے چھوڑ کر
آدمی خورشید سے دست و گریباں کیوں نہ ہو!
اک نہ اک ظلمت سے وابستہ رہنا ہے تو دوش
زندگی پر سایۂ زلفِ پریشاں کیوں نہ ہو؟

اس طرف آ اے ستم گردشِ ایّام بھی دیکھ
کامرانِ لب و رخسار کو ناکام بھی دیکھ
جو تری مست نگاہوں سے نہ تھا کل تک سرشار
آج اُسی جام کو لیے بادۂ گلفام بھی دیکھ
نیند آتی ہی نہ تھی جس کی تو آغوش میں تجھے
اب اُسی دل کو اسیرِ غمِ آلام بھی دیکھ
کل تری چشمِ کرم سے جو ہوئی تھی طالع
آج اُس صبحِ درخشاں کی ذرا شام بھی دیکھ
کامراں جس کو بنایا تھا وفا نے تیری
اب اُسی شوق کو افسردہ و ناکام بھی دیکھ
رامش و رنگ سے معمور تھے گوشے جس کے
آج اُسی انجمنِ شوق میں کہرام بھی دیکھ

جو مرے دل میں چمکتا تھا نظر سے تیری
اب اُسی نور کو خورشیدِ لبِ بام بھی دیکھ

تو نے جس عشق کی رکھی تھی مرے دل میں بنا
آہ اب اُس عشق خوش آغاز کا انجام بھی دیکھ

مرکزِ وحئ محبت تھا کبھی دل جس کا
اب اُسی جوش کو لب تشنۂ پیغام بھی دیکھ

اُٹھ، کہ آئی ہے صبا، دولتِ بیدار کے ساتھ
نغمۂ کاکل دلبوئے نفسِ یار کے ساتھ

اُٹھ، کہ خورشید نے گردوں پہ علم کھول دیا
چھیڑ کرنے کو کسی طرۂ طرار کے ساتھ

اُٹھ، کہ کہسار کی چوٹی سے چلیں وہ کرنیں
ناز کرتی ہوئی گلہائے طرحدار کے ساتھ

اُٹھ، کہ لچکی ہوئی ہر شاخ سرگرمِ نیاز
مطرب نغمہ زن و ساقیٔ سرشار کے ساتھ

اُٹھ، کہ غنچوں نے چٹکنے کا کیا ہے آہنگ
باندھ کر عہدِ وفا نرگسِ بیمار کے ساتھ

اُٹھ، کہ گلزار میں دوشیزۂ رنگین و لک
محوِ گل گشت ہے پازیب کی جھنکار کے ساتھ

اُٹھ، کہ غرفوں سے خرابات کے تنویرِ سحر
کھیلنے آئی ہے رندانِ قدح خوار کے ساتھ

دیکھ، تاریک افق پر ہے سحر کی سرخی
جوشؔ! اٹھ تذکرۂ کاکل و رخسار کے ساتھ

ہاں اس طرف بھی عابدِ شب زندہ دار دیکھ
ایمان ڈھل نہ جائے گا، صرف ایک بار دیکھ

تا کَے یہ حبسِ خیز یہ آہنگِ خانقاہ؟
آ بوستاں میں رقصِ نسیمِ بہار دیکھ

مستوریوں میں لطف و عطا کا گزر نہیں!
مستوں میں جوششِ رحمتِ پروردگار دیکھ

تا چند اشتیاقِ نمودِ ہلالِ عید!
ابروئے نازِ طرۂ زینت نگار دیکھ

اے قدردانِ سگِ مغلوبِ مسلسل
رطلِ شراب کا زرِ کامل عیار دیکھ

ظرفِ گلی میں آبِ وضو دیکھتا ہے کیا!
آ، جامِ زر میں آتشِ دانا نگار دیکھ

اک واہمہ ہے طنطنۂ شیخِ مدرسہ
آ میکدے میں دولتِ بادہ خوار دیکھ

دودِ چراغِ مسجد و محراب تا کجا؟
آ پیچ و تابِ ابرِ سر کوہسار دیکھ

تا کجے تصوّرِ لبِ نہر و خرامِ حور
نازِ سہی قدانِ لبِ جوئبار دیکھ

تا کجے ہوائے کاکلِ پیرانِ پارسا؟
اے نامراد! عربدۂ زلفِ یار دیکھ

کیا دیکھتا ہے زُہد کے کوچے میں رعبِ شیخ
کوئے مغاں میں جو کشوں کا عزّ و وقار دیکھ

پا چکا طاعت کی لذّت، درد کے پہلو بھی دیکھ
شیخ! امحراب سے باہر، خمِ ابرو بھی دیکھ

کافرِ نعمت ادا کر کچھ تو حقِ چشم و گوش
نغمۂ مطرب بھی سن، حسنِ رخِ نیکو بھی دیکھ

تا کجا طنبورۂ یزداں غریبِ خانقاہ؟
آ کسی دن میکدے کا رقصِ ہاؤ ہو بھی دیکھ

سر جھکانے ہی کو سمجھا ہے مآلِ زندگی؟
جن سے دل جھکتا ہے حق جوئی کے وہ پہلو بھی دیکھ

چونک، او دیوانۂ گل گشتِ حورانِ بہشت
دو گھڑی میدان میں آ کر رمِ آہو بھی دیکھ

ضربتِ تیغِ مجاہد کو شناخوانِ قدیم!
بے ستون پر کوہ کن کی قوتِ بازو بھی دیکھ

فرشِ مسجد سے اٹھا بھی خاک آلودہ جبیں
رکھ کے زیرِ سر کسی معشوق کا زانو بھی دیکھ

عشقِ مولیٰ کے لئے ہے عشقِ انساں ناگزیر
سازِ بے رنگی کے طالب سوزِ رنگ و بو بھی دیکھ

گیسوئے طاعت میں پیدا کر خمِ سوز و گداز
دانۂ تسبیح پر بہتے ہوئے آنسو بھی دیکھ

اے ہلالِ عید کی رویت کے مشتاق کہن
خنجرِ ابرواں کو شرماتے ہوئے ابرو بھی دیکھ

موشگافی تا کجا "واللیل" کی تفسیر میں؟
مہوشوں کے دوش پر بکھرے ہوئے گیسو بھی دیکھ

سحرِ اوراد و وظائف، ہاں مسلم ہے، مگر
نرگسِ مستانہ کا چلتا ہوا جادو بھی دیکھ

حُسن ذرّوں سے اُبلتا ہے کبھی تو جام اُٹھا
دیکھتی ہیں جو کسی کی آنکھیں جو عالم، تو بھی دیکھ

وہ شیشۂ شفق سے چھلکی مئے مغانہ
اے ساقیٔ شبینہ! ادا کر شرابِ شبانہ

ہاں اے فلک لٹا دے اپنی تمام دولت
ہاں اے زمیں اگل دے اپنا ہر اک خزانہ

رنگِ شفق کی ہلکی ہلکی گلابی روشنی ہیں
ہر غنچہ اک فسوں ہے، ہر پھول اک فسانہ

ہر شے سے پھوٹ نکلیں چشمے جوانیوں کے
ہاں اے نگارِ تو رس! ایسا کوئی ترانہ

حور دل نے لو، وہ کھولے فردوس کے دریچے
خالی نہ جائے کوئی اے مغبچو! نشانہ

مکتب ہیں بے حقیقت، جھوٹی ہیں درسگاہیں
اے عندلیب! ذاکر گل کا کتب خانہ

قربت کے ولولے بھی، ذوقِ ابعدگی بھی
قرباں ترے دو عالم، اے چشم آہوانہ

دامن چھڑا نہ دامن، دامن چھڑا نہ دامن
اے آفتِ زمانہ! اے آفتِ زمانہ

ہاں اے نگاہِ رعنا! یک لحنِ سحر پرور
ہاں اے بلند بالا! یک رقصِ جادوانہ

اے پھول! اراس آئینِ نقش و نگارِ قدرت
اے شاخِ گل! مبارک شانِ پیمبرانہ

اٹھ باغباں، خدارا گلشن میں نصب کر دے
ہلکی سی چاندنی میں پھولوں کا شامیانہ
نغموں کو تیز کر دے ہاں اے جواں مغنّی
وہ آ رہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

ہاں یار! اک اشارہ بروضعِ دل ربائی
ہاں جوشؔ! ایک نعرہ باطرزِ عاشقانہ

ٹھنڈی ہوا ہے، رقص میں ہے ابرِ بہمنی
ہاں دیر کیا ہے؟ ساقیٔ رنگین! اٹھو الغنی

انسان، اور ہو نہ سکے خوش!! اٹھا تو جام
نادان! تیرے دل کی کلی ہے شگفتنی

ہاں چھیڑ بھی رباب کہ ہے گرمِ اختلاط
حسنِ مہِ دو ہفتہ و ابریقِ یک منی

اس خاکدان میں چند رخِ محبوب و ساز کیف
اک چیز دیدنی ہے، نہ اک شے شنیدنی

آہستہ ہو کے ناز کو دعوتِ نیاز
نبضِ صنم میں گرم ہے خونِ برہمنی

اللہ، گوشِ دل کو قلقلِ مینا سے تیز کر
تا سن سکے صبا کے سخنہائے گفتنی

صہبا سے دھو نگاہ، کہ غلطاں ہے دیر سے
جاناں کے دل میں آرزوئے برقعہ افگنی

چھلکا چمن میں جام کہ یہ رُو بھی دیکھ لے
سبزے پہ اوس، اوس پہ مے، مے پہ چاندنی

واللہ آج ہند میں تو جوش فرد ہے
رحمت خدا کی تجھ پہ ہو اے مرد یک غنی

دنیا میں مجھے حور، نہ عقبیٰ میں پری دے
آ، نالۂ شبگیر و دعائے سحری دے

اُٹھ لیلیٔ دل کو رُخِ گُل رنگ عطا کر
آ، دیدۂ تخئیل کو جادو نظری دے

پوشیدہ ہیں اس خاک میں نکلتے دُرِ نایاب
خاکسترِ دل کو شررِ دیدہ وری دے

بیہودگیٔ خلعتِ ناموس کہاں تک؟
اے خالقِ وحشت! خلشِ جامہ دری دے

آلودہ ہے پھر زنگ سے انسان کا سینہ
اے نورِ دو عالم! ہنرِ آئینہ گری دے

تسکین کے ناخن سے ترے خم نہیں کھلتے
اے زلفِ سیہ! رخصتِ آشفتہ سری دے

ہاں جوش سے اُٹھتے نہیں قدرت کے حجابات
اے یارِ نہفتہ! صفتِ پردہ دری دے

جی میں آتا ہے کہ پھر مژگاں کو برہم کیجیے
کاسۂ دل لے کے پھر دریوزۂ غم کیجیے

گونجتا تھا جس سے کوہِ بے ستونِ دشتِ نجد
گوشِ جاں کو پھر انہیں نالوں کا محرم کیجیے

حسن بے پردہ کی ہے گر دعوتِ لطف و کرم
عشق کے زیرِ نگیں پھر پردۂ اسلام کیجے

دورِ پیشیں کی طرح پھر ڈالیے سینے میں زخم
زخم کی لذت سے پھر طیارِ مرہم غم کیجیے

صبح سے تا شام لیے، قصۂ عارض میں گم
شام سے تا صبح ذکرِ زلفِ برہم کیجیے

دل کے ہنگامہ کو کیجیے دل کے سناٹے میں غرق
رات کی خاموشیوں کو وقفِ ماتم کیجیے

دعوتِ آرام کافر گر ہوا ہر روح کو
ناگہانی حادثوں کو گردنیں خم کیجیے

حیطہ کی دوڑی ہوئی ہے لہر سی اجسام میں
جوش اب ہیں جرسے دوستی کیجیے

سرشار ہوں، سرشار ہے دنیا مرے آگے
کونین ہے اک لرزشِ صہبا مرے آگے

ہر نجم ہے اک عارضِ روشن مرے نزدیک
ہر ذرہ ہے اک دیدۂ بینا مرے آگے

ہر جام ہے نظارۂ کوثر مرے حق میں
ہر گام ہے گلگشتِ مصلیٰ مرے آگے

ہر پھول ہے لعلِ شکر افشاں کی حکایت
ہر غنچہ ہے اک حرفِ تمنا مرے آگے

اک مغفلہ ہے پرستشِ عقبیٰ مرے نزدیک
اک وہم ہے اندیشۂ فردا مرے آگے

ہوں کتنی ہی تاریک شبِ زیست کی راہیں
اک نور سا رہتا ہے جھلکتا مرے آگے

میں اور ڈروں صولتِ دنیائے دنی سے!
خود لرزہ براندام ہے دنیا مرے آگے

جھکتا ہے بصد عجز، کلیسا مرے در پہ
آتا ہے لرزتا ہوا کعبہ مرے آگے

پیمانے سے جس وقت چھلک جاتی ہے صہبا
لہراتا ہے اک حسن کا دریا مرے آگے

جب چاند چمکتا ہے مرے ساغرِ زر میں
چلتا نہیں خورشید کا دعویٰ مرے آگے

جب جھوم کے مینا کو اٹھاتا ہوں گھٹا میں
ہنستا ہے سرِ گنبدِ مینا مرے آگے

آتی ہے دلہن بن کے مشیّت کے جلو میں
آوارگیٔ آدمؑ و حوّاؑ مرے آگے

پیمانے پہ جس وقت جھکاتا ہوں صراحی
جھکتا ہے سرِ عالمِ بالا مرے آگے

بیٹھی ہے اک زہرہ جبیں، ہاتھ میں ساغر
اس وقت نہ دنیا ہے نہ عقبیٰ مرے آگے

جو تشنہ اٹھی ہے دشمن کی نظر مری جانب
کھلتا ہے محبت کا دریچہ مرے آگے

سے مجا بانہ بدآ، روح کو مضطر کر دے
جسم کو جادۂ بنا، خاک کو جوہر کر دے

آ تمناؤں میں بھرتا ہوا جذبۂ حیات
دل کو پھر منصبِ فیضِ [illegible] کر دے

آ شبِ یاس کو دیتا ہوا پیغامِ امید
ایک ہلچل سی سرِ بالش و بستر کر دے

آ خس و خارِ جنوں کو بھی بنا سرو و سمن
گہ شبستانِ وفا کو بھی منور کر دے

عالمِ عشق کو پھر عہدِ گل ارزانی کر
ذرۂ شوق کو پھر خسروِ خاور کر دے

ایک ہی دور میں اڑ جائے نشۂ بادۂ دوش
فتنۂ ہوش کو غرقِ مئے احمر کر دے

آ نشترِ تشنگیٔ دل کو بنا آبِ خضر
گردِ آئینۂ ہستی کو سکندر کر دے

تجھ کو اپنے لبِ گلرنگ کی قوامین کو
شبِ ہجراں کی ہوا دن دیرا دل

حسنِ گیتی کے لیے اک نازِ شایستِ دینہ
سطحِ عالم کو جوابِ عشوہ برابر کر دے

عشق کے سر کو بنا حسن کے زانوں کا تکیں
خار کو دولتِ آغوشِ گلِ تر کر دے

ہو جائے چشمۂ حیواں کا آبِ ذوق اے زلف
برسے نشانوں پہ روداں زمزم و کوثر کر دے

آبشارِ روئے کتابی کی کوئی آئینہ ناز
جوششِ وارفتہ کو شت عبیے جیبر کر دے

اے صحنِ گل ہے غرقِ تمنا ترے لئے
ڈوبا ہوا ہے رنگ میں صحرا ترے لئے

ساحل پہ سروِ ناز کو دے زحمتِ خرام
بل کھا رہا ہے خاک پہ دریا ترے لئے

ایفائے عہد کر کہ ہے مدت سے بےقرار
روحِ وفائے وعدۂ فردا ترے لئے

شانوں پہ اب تو کاکلِ شب رنگ کھول دے
بکھری ہوئی ہے زلفِ تمنا ترے لئے

اٹھ چشمِ جادو از سرِ غفلت فروش اٹھ
مچلی ہوئی ہے لرزشِ صہبا ترے لئے

دریا شمیمِ سنبل و ریحاں لئے ہوا
وا ہے مہتاب کا دریچہ ترے لئے

اے آفتابِ جلوۂ جاناں بلند ہو
کھولا ہوا ہے مطلعِ دنیا ترے لئے

سبزے کا فرش، ہوا کا خمیر، گلوں کا عطر
گلشن میں اہتمام ہے کیا کیا ترے لیے

طلبہ اور عمرِ شباب پہ عکسِ خروش ہیں
کہ منتظر سا ہے باغ میں بہار ترے لیے

جوش اور شباب خدمتِ سلطان و پاسبانِ جوش
یہ بھی کیے ہوئے ہے گوارا ترے لیے !

ہنوز شمع ہے پردے میں منہ چھپائے ہوئے
مگر کنول ہیں کہ روشن ہیں لَو جلائے ہوئے

ہنوز قطرۂ نیساں ہے اور ضمیرِ سحاب
مگر صدف ہیں کہ موتی سے گود بھرے ہوئے

ہنوز سہاگ کے سینے میں ہے رخِ آسمان
ابھی سے گئے برہمن ہیں منہ چھپائے ہوئے

ہنوز مہمانِ بادِ سحر نہیں ہوتی ہے وہ صبح
پڑے ہیں کتنے گل خون میں نہائے ہوئے

ہنوز غیبتِ خورشید سے افق ہے اداس
تمام دشت کے ذرے ہیں جگمگائے ہوئے

ہنوز چرخ پہ چھائی نہیں ہے مست گھٹا
چمن کی خاک ہے خود کو دلہن بنائے ہوئے

چمک رہے ہیں [illegible]
ہنوز غنچے ہیں [illegible] لگائے ہوئے

نہیں ملا ہے صبا کو ہنوز اذنِ خرام
مگر چراغ ابھی سے ہیں جھلملائے ہوئے

سُلگ رہے ہیں برابر ہزار ہا خرمن
ہنوز ابر میں بجلی ہیں منہ چھپائے ہوئے

ہنوز دور ہے اعلانِ تاج پوشیٔ شاہ
کھڑے ہیں کتنے گدا آسرا لگائے ہوئے

گھٹے ہوئے ہیں صبا میں ہزار ہا نامے
ہنوز زلف میں ہیں وہ گرہ لگائے ہوئے

ہنوز یار ہے خلوت گزین و حجلہ نشیں
تمام بزم کے چہرے ہیں مسکرائے ہوئے

سنا ہے جوش اٹھے گی کسی کی آنکھ ادھر
دلوں کو لوگ پہلے سے ہیں لگائے ہوئے

نمایاں منتہائے سعیِ پیہم ہوتی جاتی ہے
طبیعت بے نیازِ ہر دو عالم ہوتی جاتی ہے

اُٹھی جاتی ہے دل سے ہیبتِ آلامِ روحانی
جراحت ہیر قلبِ زار مرہم ہوتی جاتی ہے

گذار کر رہا ہے روح سے ہیجانِ سرتابی
مگر گردِ جستجو کے ذوق میں ضم ہوتی جاتی ہے

جنوں کا چھا رہا ہے زندگی پر اک دھندلکا سا
خرد کی روشنی مبہم میں مدغم ہوتی جاتی ہے

نسیمِ بے نیازی آ رہی ہے بامِ گردوں سے
عروسِ مدعا کی زلف برہم ہوتی جاتی ہے

نمایاں ہو چلا ہے اک جہاں چشمِ تصور سے
نظر شاید حریفِ ساغرِ جم ہوتی جاتی ہے

گرہ یوں کھل رہی ہے ہر نفس ذوقِ تماشا کی
کہ ہر ادنیٰ سی شے اب ایک عالم ہوتی جاتی ہے

فضا میں کانپتی ہیں دھندلی نقرئی شکلیں
ہر اک تخئیلِ پاکیزہ مجسم ہوتی جاتی ہے

نہ جانے سینۂ احساس پہ یہ بات ہے کس کا
طبیعت بے نیازِ شادی و غم ہوتی جاتی ہے

سمجھ میں آ گئیں کیا باریکیاں قانونِ قدرت کی
عبارت کثرتِ معنی سے مبہم ہوتی جاتی ہے

خجل تھا جس کی شورش سے تلاطم بحرِ ہستی کا
مرے دل میں وہ ہلچل جوش اب کم ہوتی جاتی ہے

لے لیا دل اُس ہوس ربا نے — کانِ شوخی، — جانِ حیا نے
آفتِ جاں نے فتنۂ شہر نے — جانِ جہاں نے — روحِ رواں نے
موجِ تبسم کے دامن میں — برق کی رو، — بجلی کے دانے
دفترِ غمزۂ الفت جو میں ہے — صبحِ چمن کے، — تازہ ترانے
بکھری اُلجھی خراد سب ہیں — شامِ طرب کے، — لاکھ فسانے
بندشِ لعلِ لبِ شکّر میں — کتنے ہیں پیچ، — کتنے بہانے
رقصاں تابِ حسن تبسم میں — کیف کے دن، — شورش کے زمانے
رُخ پر کافر زلف کی بدلی — جیسے لمحے، — شب کے سہانے
گاہ بہ لب چشمۂ نوشیں — گاہ بہ گردن — تیغ بہ زلنے
گاہ بہ جلوت سازندگی کا — گاہ بہ خلوت، — شعلہ زمانے
گاہ بہ گفتن شبنم رت! — گاہ بہ رفتار، — آبِ روانے
گہ بہ تلطف نرم ہیے! — گہ بہ تحکم، — سخت کمانے
گاہ بہ شوخی مست غزالے — گاہ بہ مستی — خواب گہانے
گاہ بہ نورِ صبح بسینے" — گاہ بہ ایرِ شام — "نگ سے"
گاہ بہ مسند گہ بہ سینے" — گاہ بہ پہلو — "رازِ نہانے"
شکر کہ بختِ جوشِ غمزہ سے — کھولدئے پھر — زلفِ پریشانے

مجھ سے ساقی نے کہی رات کو کیا بات اے جوشؔ
یعنی اضداد ہیں یہ درود یک ذات اے جوشؔ

مست و بیگانہ گزر جا کرۂ خاکی سے
یہ تو ہے رہ گزرِ سیلِ خیالات اے جوشؔ

اور تو اور، خود انسان بہا جاتا ہے
کتنا پُر ہول ہے طوفانِ روایات اے جوشؔ

لوگ کہتے ہیں حجابات نہیں جز آیات
کس سے کہیے کہ یہ آیات خود ذات اے جوشؔ

اہلِ الفاظ شریعت پہ مٹے جاتے ہیں
کس کو سمجھاؤں مشیّت کے اشارات اے جوشؔ

دیکھیے صبحِ جنوں، ذہن میں کب طالع ہو
عقل، سنتا ہوں کہ ہے اک ابدی رات اے جوشؔ

قوتِ کُل کے مصالح سے اور اتنے بدظن!
وائے بر دغدغۂ اہلِ مناجات اے جوشؔ!

ساغرِ مے ہی میں ہوتا ہے طلوع اور مہر و ب
آفریں بر دلِ رندانِ خرابات اے جوشؔ

کون مانے گا کہ ہیں عین مشیّت واللہ
زندگانی کے یہ بگڑے ہوئے عادات اے جوشؔ

تجھ کو کیا، فقر میں راحت ہے کہ شاہی میں فراغ
تو تو ہے محفلِ پیرِ خرابات اے جوشؔ

اُدھر مذہب، اِدھر انساں کی فطرت کا تقاضا ہے
وہ دامانِ مہِ کنعاں ہے، یہ دستِ زلیخا ہے
اِدھر تیری مشیت ہے، اُدھر حکمت رسولوں کی
الٰہی! آدمی کے باب میں کیا حکم ہوتا ہے۔
یہ مانا دونوں ہی دھوکے ہیں رندی ہو کہ درویشی
مگر یہ دیکھنا ہے کون سا رنگین دھوکا ہے؟
کھلونا تو نہایت شوخ و رنگین ہے تمدّن کا
مُعترف میں بھی ہوں، لیکن کھلونا پھر کھلونا ہے
مرے آگے تو اب کچھ دن سے ہر آنسو محبت کا ہے
کنارِ آب رکنا باد و گل گشتِ مصلّےٰ ہے
مجھے معلوم ہے جو کچھ تمنّا ہے رسولوں کی!
مگر کیا درحقیقت وہ خدا کی بھی تمنا ہے؟
مشیّت! کھیلنا زیبا نہیں میری بصیرت سے
اٹھا لے ان کھلونوں کو، یہ دنیا ہے وہ عقبیٰ ہے

بادۂ سرجوش

(۲)

قدیم رنگِ تغزّل

۱۹۲۰ء ــــــ ۱۹۲۶ء

۱۹۲۱ء

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا، میں نے تجھے یاد کیا

اے میں سو جان سے اس طرزِ تکلم کے نثار
پھر تو فرمائیے کیا آپ نے ارشاد کیا

اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا

اتنا مانوس ہوں فطرت سے، کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا!

میری ہر سانس ہے اس بات کی شاہد اے موت
میں نے ہر لطف کے موقع پہ تجھے یاد کیا

مجھ کو تو ہوش نہیں، تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

کچھ نہیں اس کے سوا جوشؔ حریفوں کا کلام
وصل نے شاد کیا ہجر نے ناشاد کیا

وہ غریب دل کو سبق ملے کہ خوشی کے نام سے ڈر گیا
کبھی ہنس کے تم نے بھی بات کی تو ہمارا چہرہ اتر گیا
جو بہار ملتی تو پوچھتا کہ کہاں وہ کیفِ نظر گیا
وہ صبا کی شوخیاں کیا ہوئیں، وہ چمن کا حسن کدھر گیا؟
تری راہ کا یہ اصول ہے کہ شکست مانے تو فتح ہو
جو چلا اکڑ کے وہ گر پڑا، جو جھکا لرز کے ابھر گیا
میں رموزِ دل سے تھا آشنا، مجھے علم شرطِ قبول تھا
نہ مری پلک سے نمی گئی، نہ مری دعا سے اثر گیا
وہ شکارِ جلوۂ دہر تھے، میں ہلاک پرتوِ یار تھا
وہ سنور سنور کے بگڑ گئے، میں بگڑ بگڑ کے سنور گیا
یہ عجیب حسن کے رمز تھے، یہ تری ادائے ناز کے بھید تھے
وہ نقاب الٹ کے جو آ گیا، کوئی جی اٹھا، کوئی مر گیا
تمہیں آہیں سننے کا شوق تھا، مگر اب بتاؤ کرو گے کیا؟
جو کراہتا تھا تمام شب، وہ مریضِ جوشش تو مر گیا

کعبہ و دیر و حرم یاد آیا ...
رخصت اے مطربِ رنگیں رخصت۔
درِ جاناں پہ جبیں سائی کا۔
فخر تو مخصوص ہے نامۂ شوق

پھر کوئے صنم ہمیں یاد آیا
آج پھر دیدۂ نم یاد آیا ...
پھر جبیں جادۂ چشم یاد آیا ...
پھر وہ سرِ طاس و قلم یاد آیا

مٹ چلی تھی خلشِ سجدۂ شوق
پھر ترا نقشِ قدم یاد آیا

جس نے پیچیدہ کئے تھے عقدے
پھر اسی زلف کا خم یاد آیا

ہمنشیں! تو نے بھلایا تھا جسے
پھر ترے سر کی قسم یاد آیا

بزمِ خوباں میں جو حاصل تھا کبھی
جوشؔ کو پھر وہ بھرم یاد آیا

سنہ ۱۹۲۲ء

سنہ ۱۹۲۲ء

جواں ہوں ہر چند، پھر بھی چہرہ ہے جوشؔ بے آب و تاب میرا
مری عروسِ سخن کے رُخ پر جھلک رہا ہے شباب میرا

جہاں تھا داؤد سا مغنّی، جہاں تھی یوسف سی شمعِ رنگیں
اسی شبستاں میں بہرِ نغمہ ہوا ہے اب انتخاب میرا

اُدھر مری نغمہ سنجیوں سے، تری جبیں پر ہے اک دمک سی
اِدھر ترے رخ کی تابشوں سے جھلک رہا ہے رباب میرا

تری تجلی کہاں نہیں ہے، تری کچھ اس میں خطا نہیں ہے
مخل ہے میرا غبارِ ہستی، مری نظر ہے حجاب میرا

جو اشک دل میں کھٹک رہا تھا، ٹپک پڑا صبحِ چشمِ تر سے
سحر کی تنویر پھیلتے ہی ہوا غروب آفتاب میرا

مری فراست میں شیب آ کر اضافہ کچھ بھی نہ کر سکے گا
کچھ ایسے پیچیدہ راستوں سے گزر رہا ہے شباب میرا

سنہ ۱۹۲۲ء

زہرِ دولت کر چکا جب ہم، شرم آتی تو کیا
اب ہوس اپنے کئے پر جوشؔ پچھتاتی تو کیا

راس اوّل تو نہ آئے گی زمانے کی ہوا
راس بھی دو دن زمانے کی ہوا آئی تو کیا

موت کی جانب مڑا ہے بڑھ کے ہر اک راستہ
زندگی نے عافیت کی راہ دکھلائی تو کیا

صبح کی کرنیں جگا ہی دیں گی خوابِ ناز سے
رات نے کلیوں کی دم بھر آنکھ جھپکائی تو کیا

اصل کی جانب جھکا دے گی زمانے کی ہوا
پنکھڑی بن کر چمن کی خاک اترائی تو کیا

سلسلہ خوابِ پریشاں کا نہ ٹوٹا صبح تک
ہم کو ہجرِ یار میں اے جوشؔ نیند آئی تو کیا

سنہ ۱۹۲۳ء

بے ہوشیوں نے اور خبردار کر دیا
سوئی جو عقل، روح کو بیدار کر دیا

اللہ ری حُسنِ دوست کی آئینہ داریاں
اہلِ نظر کو نقش بدیوار کر دیا

یارب! یہ بھید کیا ہے کہ راحت کی فکر نے
انساں کو اور غم میں گرفتار کر دیا

دل کچھ پنپ چلا تھا تغافل کی رسم سے
پھر تیرے التفات نے بیمار کر دیا

کل ان کے آگے شرحِ تمنا کی آرزو
اتنی بڑھی کہ نطق کو بے کار کر دیا۔

مجھ کو وہ بخشتے تھے دو عالم کی نعمتیں
میرے غرورِ عشق نے انکار کر دیا

یہ دیکھ کر کہ ان کو ہے رنگینیوں کا شوق
آنکھوں کو ہم نے دیدۂ خوں بار کر دیا

۱۹۲۳ء

جو چاہنا اختیار کرنا! دنیا پہ نہ اعتبار کرنا
اے حشر یہ تجھ سے التجا ہے اب ہم کو نہ ہوشیار کرنا
اے بادِ صبا! اس آشنا کو ہم سے بھی کبھی دوچار کرنا

حاصل ہو خدا کرے تجھے ہوش
نظارۂ روئے یار کرنا...

یہ عجیب رنگ تھا نئے گلشن، کہ ہر ایک چہرے پہ نور تھا
یہ گماں ہے مجھ کو، گزشتہ شب کوئی مست غم میں ضرور تھا
میں تڑپ کے حسن کو پا گیا، وہ چمک کے خاک میں مل گیا
میں شہید جلوۂ بے خودی، وہ ہلاک رنگ شعور تھا
مرے سامنے تھا وہ جلوہ گر، اسے پا سکی نہ مری نظر
یہ ضیائے کثرت جلوہ تھی، یہ ہجوم شان ظہور تھا
عجب حسن قبول تھا کہ بنیں خاک راہ وفا بنا
ستم زمانہ سے ایک دن مجھے خاک ہونا ضرور تھا
یہ صبا سے خاک اڑائی کیوں، یہ چمک کے غنچے نے کیا کہا
مجھے وہم ہوتا ہے ہمنوا، کوئی بھید اس میں ضرور تھا

وہ صبر دے کہ نہ دے جس نے بے قرار کیا؟
بس اب تمہیں پہ چلو ہم نے انحصار کیا
تمہارا ذکر نہیں ہے تمہارا نام نہیں
کیا نصیب کا شکوہ ہزار بار کیا!
ثبوت ہے یہ محبت کی سادہ لوحی کا!
جب اس نے وعدہ کیا، ہم نے اعتبار کیا
تمام ہم نے جو دیکھا سکون و جنبش کا!
تو کچھ سمجھ کے تڑپنا ہی اختیار کیا

مرے خدا نے مرے سب گناہ بخش دیے
کسی کا رات کو یوں میں نے انتظار کیا

۱۹۲۴ء

سحر ہوئی مسکرا رہا ہے، ہر اک ستارے میں نور تیرا
گلوں میں تیری شگفتگی ہے، صبا میں جوش سرور تیرا
ہر ایک دانہ ہے ماہ پیکر، ہر ایک ذرہ ہے رشک گوہر
وقار دولت، شکوہ طاقت، کسی سے جھکتے نہیں جہاں میں
ہم اہل دل کی فروتنی میں بھرا ہوا ہے غرور تیرا
جنوں کے شانوں پہ کیوں پریشاں ہے زلف اس آفت جہاں کی
یہ راز دل ہے، نہ پا سکے گا کبھی دماغ شعور تیرا
وہی ہوا، اور کیوں نہ ہوتا، کچھ ایسی افتاد ہی تھی دل کی
میں کہہ چکا تھا یہ ایک نہ اک دن شکار ہوگا غرور تیرا

۱۹۲۵ء

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال، روز حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

یہی تو ہیں دو ستون محکم، انہیں پہ قائم ہے نظمِ عالم
یہی تو ہے رازِ خلدِ آدم، نگاہ میری شباب تیرا
صبا تصدق ترے نفس پر، چمن ترے پیرہن پہ قرباں
شمیمِ دوشیزگی میں کیسا بسا ہوا ہے شباب تیرا
تمام محفل کے رو برو گو اٹھائیں نظریں، ملائیں آنکھیں
سمجھ سکا ایک بھی نہ لیکن، سوال میرا جواب تیرا
ہزار شاخیں ادا سے لچکیں، ہوا نہ تیرا سا لوچ پیدا
شفق نے کتنے ہی رنگ بدلے کھلا نہ رنگِ شباب تیرا
ادھر مرا دل تڑپ رہا ہے، تری جوانی کی جستجو میں
اُدھر مرے دل کی آرزو میں مچل رہا ہے شباب تیرا
کرے گی دونوں کا چاک پردہ، رہیگا دونوں کو کرکے رسوا
یہ شورشِ ذوقِ دید میری، یہ اہتمامِ حجاب تیرا
جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جائیں، فلک تو کیا عرش کانپ اٹھتا
اگر میں دل پر نہ روک لیتا تمام زورِ شباب تیرا
کھلا ہوا جوش نے ہٹایا نگاہ کا جیسے ترے پردہ
بلا سے جاتی رہیں گرم تہمتیں، کھلا تو بندِ نقاب تیرا

۱۹۲۵ء

کیوں چپ ہیں سب، مریضِ محبت کو کیا ہوا؟
ان کا یہ پوچھنا تھا کہ محشر بپا ہوا؟

زحمت نہ ہو تو در پہ ذرا چل کے دیکھ لو
آیا ہے کوئی اپنا پتا پوچھتا ہوا!

یہ میرا ذوقِ بادہ کشی، اور یہ تشنگی!
معبود! تیری شانِ کریمی کو کیا ہوا

اک تم کہ اہلِ دل کی نظر پر چڑھے ہوئے
اک میں کہ ہوں خود اپنی نظر سے گرا ہوا

شاعر کا دل، مناظرِ قدرت سے بے نیاز
پیغمبر اور کلامِ خدا سے بھرا ہوا

۱۹۲۶ء

خاک میں پیدا اگر ذرِ کیمیا ہو جائے گا
جس صنم کو عشق پوجے گا خدا ہو جائے گا

عشق بھی کیا شے ہے، تم جس شغل سے کھو رہے گے
وہ ہماری زندگی کا مدعا ہو جائے گا

عقل کہتی ہے غلط ہے ایک اک پیماں دوست
عشق کہتا ہے کہ ہر وعدہ وفا ہو جائے گا

ہر تمنا کے نکلنے پر نہ ہو اتنا مُصر
ورنہ اپنی زندگی سے تو خفا ہو جائے گا

تم بھی آؤ، ورنہ کلیوں کا چٹکنا باغ میں
میرے دل کے ٹوٹ جانے کی صدا ہو جائے گا

جوشؔ میرے حق میں جو بت بن چکا تھا رہزن
کیا خبر تھی برہمن بن کر خدا ہو جائے گا

۱۹۲۷ء

پہچان گیا سیلاب ہے اُس کے سینے پہ ہواؤں کا
[illegible] جو سینے کو میرے، جی چھوٹ گیا [illegible]
یہ شوخ فضا، یہ تازہ چمن، یہ مست گھٹا، [illegible]
کافر ہے، اگر اس وقت بھی کوئی رخ نہ کرے [illegible]
یہ کس کی حیات افروز نظر نے چھیڑ دیا، [illegible]
ہر خاک کے ادنیٰ ذرے میں ہنگامہ ہے [illegible]
[illegible] پا بستہ رکھ دے، [illegible]
فریاد [illegible] لوٹ گیا، پھر کا نشہ [illegible]
[illegible] بڑی [illegible]
[illegible] رقص گھر [illegible]
[illegible] یوں غم میں نہ [illegible]
[illegible] شمع [illegible]

دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقائق کی تلخی
اور ہم نے حقائق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا
کمبخت جوانی سینے میں ناگن کی طرح لہراتی ہے
ہر موج نفس اک طوفاں ہے کونین شکن ارمانوں کا
انگڑائی نگاوٹ سے لے کر آنکھوں کو یہ کس نے گردش دی
کلیوں کو ٹھنڈے آئے پسینے رنگ اڑا پیمانوں کا
اے جوش؛ جنوں کی شام و سحر میں وقت کی یہ رفتار نہیں
داناؤں کی طولانی صدیاں اور ایک نفس دیوانوں کا

ابھار کر مٹائے جا، بگاڑ کر بنائے جا
کہ میں ترا چراغ ہوں جلائے جا بجھائے جا

ہنوز شہریاریاں رہین کبر و ناز ہیں
مآل تاج و تخت کی کہانیاں سنائے جا

رخ نگار زندگی نقاب در نقاب ہے
نہ ہوگا ختم سلسلہ مگر نقاب اٹھائے جا

جنوں کی شاہراہ سے نہ ہٹ سکا قدم مرا
خرد نے لاکھ دی صدا مجھے بھی آزمائے جا

فغاں کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے
سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا

۱۹۲۷ء

ہٹ گئے دل سے تیرگی کے حجاب
آفریں اے نگاہ عالمتاب
آ پڑے آیا نہ کوئی مشکل میں
مشورے دے کے ہٹ گئے احباب

کیا قیامت تھی صبر کی تلقیں
اور بھی روح ہو گئی بے تاب
بارے اٹھے تو نا صح مشفق!
ہاں کدھر ہے صراحی مۓ ناب!

ہاں اثر اب ہوا محبت کا!
ہم سے آنے لگا ہے ان کو حجاب
شب جو بیٹھے وہ میرے پہلو میں
مسکرانے لگی شب مہتاب!

جوش کھلتی تھی جن سے دل کی کلی
کیسے وہ لوگ ہو گئے نایاب

۱۹۲۲ء

چاندنی میں آپ یاد آئے بہت
شب کو آنسو ہم نے ٹپکائے بہت
ہم، نہ آنا تھا، نہ آئے دام میں
نازاس دنیا نے دکھلائے بہت
کل جو آئے وہ عیادت کو مری
سوچ کر کچھ جی میں پچھتائے بہت

سنہ ۱۹۲۸ء

مل گئی کشمکشِ تلخیٔ دوراں سے نجات
واہ کیا بات ہے اے دلبرِ شیریں حرکات

خاک پر نور کی تحریر نظر آتی ہے
مجھ کو ہیں عرش سے ٹوٹے ہوئے تارے ذرات

عشق کی مشق تصور کو نہ ٹھکرا ظالم!
مجلسِ گنج نہیں انجمنِ لات منات

دیکھ گردوں سے صحیفے کی الٹ کر اوراق
چھانٹ تار دل پہ اک تارے تو فقط ہیں ذرات

جن کو کہتی [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

آئینہ [illegible] معبود!
[illegible] ہیں خستہ مجروح

سنہ ۱۹۲۳ء

سامنے آسانیاں آتی ہیں دشواری کے بعد
روح کو ہوتی ہے صحت، دل کی بیماری کے بعد

کھلتے ہیں انساں پر نیرنگی قدرت کے راز
اشکِ خوں آلود سے بہتر ہے یہ گلکاری کے بعد

کیوں جنوں ہم کو نہ ہوتا، یہ ہے اک رسم قدیم
عقل سو جاتی ہے اکثر دل کی بیداری کے بعد

سب سے پہلے اک اجالے کا آتا ہے خیال
وقتِ سحر اسے ہے تو شب بیداری کے بعد

سنہ ۱۹۳۳ء

بڑھتا جاتا ہے زندگی برباد
ترک کر دو یہ شغل [illegible]
انساں کی [illegible] کی خاطر
[illegible] کرے [illegible] دل [illegible]
[illegible] سے دیگا [illegible]
[illegible]

اے مرے دیر آشنا! فریاد
ہاں مرا [illegible] آپ کا ارشاد
[illegible] ہم سے عزتِ اجداد
اسے کہتے ہیں ہر چیز باد باد
ہو سکے کیسے دیکھو سے برباد
[illegible] ہے اور دستِ [illegible]

[illegible] کی [illegible] سے
خاک [illegible] کی قسمت [illegible] آباد

اب دیکھ اس کا حال، کہ آتا نہ تھا قرار
خود تیرے دل کو بھی یہ عنایت کئے بغیر

اے ہم نشیں محال ہے ناصح کا ٹالنا
یہ اور یہاں سے جائیں نصیحت کئے بغیر

تم کتنے تند خو ہو کہ پہلو سے آج تک
اک بار بھی اُٹھے نہ قیامت کئے بغیر

چلتا نہیں ہے محفلِ حسن و جمال میں کام!
ہر جنبشِ نظر سے عبادت کئے بغیر

مانا کہ ہر قدم پہ قیامت ہے پھر بھی جوش
بنتا نہیں کسی سے محبت کئے بغیر

۱۹۲۵ء

ہلال سر پہ ہے، بیٹھا ہوں کیف میں سرشار
خموش رات کے جنبش میں ہیں لبِ گفتار

مرے ضمیر میں فسوں سے ہے وہ کیفیت!
فرازِ چرخ پہ جس طرح صبح کے آثار!

ہوا کی رَو میں گئی دل سے کہہ رہا ہے کوئی
کہ تجھ سے رازِ دو عالم ہے مائلِ گفتار

میں ہوں تو ذرۂ خاکی مگر وہ ذرہ ہوں
جو آفتاب سے رہتا ہے برسرِ پیکار!

۱۹۲۴ء

آزاد نقشِ دنیا ہیں، پروائے اُمید و بیم نہ کر
جب تک نہ ملیں فطرت کے قدم، خم دیکھ سرِ تسلیم نہ کر
سینے میں ہے آگ کے سوز اگر، شیطاں کے قدم سے آنکھوں
بیگانۂ دردِ دل ہے اگر، جبریل کی بھی تعظیم نہ کر
کتنی ہی شعاعیں ابر میں ہوں، خورشید جنوں پر ایماں لا
کتنے ہی دلائل روشن ہوں، دانش کو کبھی تسلیم نہ کر
سانچوں میں برابر ڈھلتا جا، رفتارِ جہاں سے پھیر نہ منہ
تنبیہ تو کیا، اس وقت بینا ہے تو کچھ تفہیم نہ کر
اے جوش ہجومِ کلفت میں فریاد و فغاں سے کام نہ لے
گھٹ جائے گا اس سے دل کا اثر، جز لے تپش تقسیم نہ کر

۱۹۲۴ء

عشوؤں کو چین ہی نہیں آفت کئے بغیر
تم اور مان جاؤ شرارت کئے بغیر
اہلِ نظر کو یاد رکھا تا رہِ وفا!
اے کاش ذکرِ دوزخ و جنت کئے بغیر!

ازل سے گرمِ عمل گو ہے مذہبِ اخلاق
خداں، کہ آج تک المنابعت ہے سینہ فگار

اس انجمن میں ہے زاہد تجھے غرورِ صلوٰۃ
ق
جس انجمن میں ہے عصمت کو جرم کا اقرار

خدا کی شان، وہاں نازِ پاک دامانی
جہاں زبانِ رسالت ہے محوِ استغفار

وہ روح اسینۂ عالم میں ہے جو خوابیدہ
خدا کا شکر کہ میرے نفس میں ہے بیدار

۱۹۲۳ء

بہتر تو یہی ہے ستارہ، کہ تو وہ ہے، خود کو تباہ نہ کر!
یہ سچ نہ پڑے تو کم سے کم، خاموش ہی رہ اور آہ نہ کر
کچھ دل میں یہ دنیا غش کھا کر قدموں پہ ترے جھک جائیگی
غمہائے مصائب سے نہ جھک، پروائے غمِ جاناں نہ کر
جو غفلت پہ عالم طاری ہو، کچھ فضل کو اس میں راہ نہ دے
الفاظ کے گھیرے سے، از دل سے اپنے کو بھی تو آگاہ نہ کر

۱۹۳۳ء

اے قیامت نگاہ و برقِ جمال — خونِ اہلِ نظر تجھ کو حلال!

دل آشفتہ کار کے ہاتھوں زندگی ہم کو ہو گئی ہے وبال
آنکھیں پھر جوش ڈھونڈتی ہیں انہیں
کل سے پھر مست ہے نسیم شمال

۱۹۶۱ء

آستاں پر جب کسی کافر کے جھک جاتا ہے دل
اپنے سجدے کا، حرم کو حکم فرماتا ہے دل

سخت حیراں ہوں کہ ہستی کے بلند و پست سے
کتنی آہستہ خرامی سے گزر جاتا ہے دل!

آنے والا ہے یکایک کیا مسرت کا پیام؟
بیٹھے بیٹھے آج کیوں میرا ابھر آتا ہے دل

اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں قدسی کانپنے لگتا ہے عرش
جب کسی معشوق کا عاشق پہ آجاتا ہے دل!

ہم نشیں! الفاظ میں تشریح ہو سکتی نہیں
کیا بتاؤں کس طرح راتوں کو گھبراتا ہے دل

سچ بتا اے ہمنشیں! کیا عشق اسی کا نام ہے
سانس کے ہمراہ سینے سے اڑا جاتا ہے دل

ایسے سجدے بھی کبھی دیکھے ہیں اے فرش حرم؟
سر تو کیا، اس کی طرف میرا جھکا جاتا ہے دل

آہ یہ دنیا! کہاں ہے موت؟ اے کمبخت ہوش
میرا اس ویران آبادی میں گھبراتا ہے دل

۱۹۲۱ء

ان سے جاکر صبا یہ کہہ پیغام
نیند راتوں کی ہو گئی ہے حرام
اے فدائے بدن و دل میرا
جلوہ گستر ہو مہر ناتمام؛
یہ چلا کون اٹھ کے پہلو سے؟
دل کی بستی میں پڑ گیا کہرام!
جتنے آشفتہ حال شہر میں ہیں
جوش کو مانتے ہیں اپنا امام

باز دلا کے اڑتے ہیں روح الامیں سے ہم
کرتے ہیں سیر عالم بالا یہیں سے ہم
لب اپنے بند رکھتے ہیں غوغائے عام ہیں
کھلتے ہیں نکتہ سنج و سخن آفریں سے ہم
اے ساکنان دیر و حرم! کہہ رہے ہو کیا؟
باہر کھڑے ہیں حلقۂ دنیا و دیں سے ہم
اے غنچۂ صباح! نہ بول مسکرا کے دیکھ!
واقف ہیں ان کے خندۂ ناز آفریں سے ہم

دامن کسی کا ہاتھ میں آ کر نکل گیا
بیٹھے پسینہ پونچھ رہے جبیں سے ہم

شکرِ خدا کہ اتنے مصائب کے باوجود
واقف نہیں ہیں خاطرِ اندوہگیں سے ہم

اہلِ جہاں! ہمارا نشیمن ہے آسماں
ناآشنا ہیں رسم و رواجِ زمیں سے ہم

ہم بیکسوں کی شان کبھی میکدے میں دیکھ
کرتے ہیں نازِ جبہ فلک، ہفتمیں سے ہم

مستی ہمارا رہنما ہے ہر اک اپنے طور پر
کیا جوشؔ کہہ گئے نگہِ واپسیں سے ہم

سنہ ۱۹۲۳ء

اپنی ان انکھڑیوں کی تجھ کو قسم
ہاں ادھر بھی کبھی لگا کے قدم

آسماں نے ہے کیا بلا ہمدم
آج پھر دل میں درد ہے کم کم

لذتِ مرگ اے معاذ اللہ
وائے بر خضر و عیسیٰ و مریم!

یوں بھی اے دل کوئی دھڑکتا ہے
کا کلیں ان کی ہو گئیں برہم

تیری رفتارِ ناز کے قربان
بنتے ہیں میرے دل پہ نقشِ قدم

یوں نہ چھیڑو کہ بات ہے کھو کر!
پھر بہت تم کو یاد آئیں گے ہم

چین سے بیٹھنے نہیں دیتی
جوشؔ اس دل کا کاوشِ پیہم

۱۹۲۲ء

ترے سنگِ در سے بدل دیا ہے یہ پیپیوں کو فراز میں
کہ ہزار طور جھلک رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
مرا پیرہن نہیں چاک ابھی، مجھے زخم کھانے سکھا بھی دے
یہ مہک جنوں کی بکھری ہوئی ہے جو تری زلفِ دراز میں
یہ وفا کا رنگ شکستہ ہے بھری حسرتوں کا یہ خون ہے
یہ گلاب کی سی جو سرخیاں ہیں ترے تبسمِ ناز میں
یہ ترے غرور کو کیا خبر کہ ازل کے روز سے دخل ہے
مرے عشقِ سادہ مزاج کو ترے حسنِ عشوہ طراز میں
چمک اے حقیقتِ دستاں، مجھے تازہ بھا چکے ہیں ڈھال دے
میں وہ شمع ہوں جو پگھل چکی ہے تمام بزمِ مجاز میں
جو بہارِ عشق ہو دیکھنا، کبھی غنچہ نو پہ نگاہ کر!
کہ شمیمِ گلشنِ خسروی ہے قباہ کو بوئے ایاز میں!
نظر آ گئے یہ سبھی، انگڑائیوں میں طلوعِ صبح کا رنگ ہے
وہ بجھا کے شمع سفر رہے ہیں سحر کو خلوتِ ناز میں
یہ ستارۂ سحری کی ضو ہے افق کی سرخ بساط پر!
کہ دلِ نیاز دھڑک رہا ہے کسی کے پہلوئے ناز میں
مجھے ان کا محرمِ راز کر، انہیں میرے راز سے کھول دے
یہ جو خط ہے تری جبیں پہ ہیں، یہ جو خم ہیں زلفِ دراز میں
جو صنم کدوں میں بیاں کروں، تو صنم بھی سجدہ میں گر پڑیں
وہ ملا ہے پچھلے پہر مزا مرے دل کو جوشِ نماز میں

سنہ ۱۹۲۷ء

جہنم سرد ہے جنت کے در کھلوائے جاتے ہیں
سرِ محشر ہماری حسن کے بلوائے جاتے ہیں

غضب ہے یہ ادا اُن کی دمِ آرائشِ گیسو
جھکی جاتی ہیں آنکھیں خود بخود شرمائے جاتے ہیں

طلسمِ دہر کے اسرار کھل جائیں عجب کیا ہے
اب اپنے دل کے کچھ آثار ایسے پائے جاتے ہیں

سحر کی ضو، شفق کی سرخیاں، برسات کے بادل
مجھے ہمراز پا کر یہ مناظر کھائے جاتے ہیں

نہ جانے کتنی رنگیں صحبتیں ہیں میری نظروں میں
بس اے مطرب! مری آنکھوں میں آنسو آئے جاتے ہیں

شبِ وعدہ یہ کیسی تیرگی ہے؟ وقت کیا ہوگا
تمناؤں کے غنچے، ہم نفس! کمھلائے جاتے ہیں

کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن، اور ہم شرمائے جاتے ہیں

بہت جی خوش ہوا اے ہمنشیں! کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

سنہ ۱۹۲۱ء

سمجھے گا اس کے درد کو کون شورشِ کائنات میں
تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں!
آنکھیں تری اداس ہیں رخصتِ عشوہ دے انھیں
برقِ نظر چھپی ہے کیوں ابرِ تکلفات میں

سانس میں بوئے بادہ ہے سجدے ہیں پائے یار پر
اب بھی دماغِ زہد کو شک ہے مری نجات پر
تاروں کی جھلکیوں ہی پر کیجیے کیوں نہ اکتفا!
ڈھونڈیئے آفتاب کیوں جوشؔ اندھری رات میں

سنہ ۱۹۲۶ء

آنکھیں ہتھیلیوں سے مل، نیند ہے چشمِ ناز میں
پھر نہ رہے حنا کا رنگ بھی نرگسِ نیم باز میں
چھیڑ دوں کبھی جو رات کو تار، رسے خوں ٹپک پڑے
درد بھرا ہوا ہے وہ، دل کے شکستہ ساز میں

میرے گدازِ عشق کا تم پہ اثر ہوا ضرور
ناز کا رنگ آچلا میرے دلِ نیاز میں
دیکھنا لوٹنے پہ ہے جوشؔ کا دل بھی عنقریب
ذکر تھا کل یہ حسن کے خلوتِ بیانِ راز میں

۱۹۳۶ء

یہ ہم جو تابشِ حسنِ بشر کو دیکھتے ہیں
کسے خبر کہ خود اپنی نظر کو دیکھتے ہیں!

وہ داغِ سینۂ شاعر کو دیکھ سکتے کاش
جو لوگ شعر کے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

قفس کے دیکھنے والے بڑی حقارت سے
پلٹ پلٹ کے مرے بال و پر کو دیکھتے ہیں

برا ہو وہم کا، لکھا تو ہے انہیں خطِ شوق
اداس ہو کے مگر نامہ بر کو دیکھتے ہیں!

ہمیں نہیں ہے کچھ اعمالِ جوشؔ سے مطلب
کہ ہم تو صرف متاعِ ہنر کو دیکھتے ہیں

سنہ ۱۹۴۳ء

پایانِ عشق بستۂ دامِ ہوا نہیں — صد شکر دل میں ابھی خلشِ مدعا نہیں
گمراہ ہو نہ جاؤں میں اے حسنِ بے نقاب — اس خیرگی میں مجھ کو تو کچھ سوجھتا نہیں
کس حد کا دلنشین ہے محبت کا بھی [illegible] — ایک بار جس کو یاد ہوا بھولتا نہیں
ساقی نگاہِ کم سے ہمیں دیکھتا ہے جو — دراصل وہ غریب ہمیں جانتا نہیں
اس نامرادِ عشق کی تلخی کو کیا کروں — ہر چند جس سے کام ہے وہ بے وفا نہیں

واقف ہے جوشؔ عشق سے اپنے تمام شہر
اور ہم یہ جانتے ہیں کوئی جانتا نہیں

سنہ ۱۹۲۴ء

یہ بات، یہ تبسم، یہ ناز، یہ نگاہیں — آخر تمہیں بتاؤ کیونکر نہ تم کو چاہیں
اب سر اٹھا کہ میں نے شکووں سے ہاتھ اٹھایا — مر جاؤں گا ستمگر، نیچی نہ کر نگاہیں
کچھ گل ہی سے نہیں ہے روحِ نمو کو رغبت — گردن میں خار کی بھی ڈالے ہوئے ہے باہیں
اللہ ری دلفریبی جلووں سے ہے کسی کی — محفل میں وہ جو آئے کج ہو گئیں کلاہیں

یہ بزم، جوش، کس کے جلووں کی رہگزر ہے
ہر ذرہ میں ہیں غلطاں اٹھتی ہوئی نگاہیں

سنہ ۱۹۲۳ء

اے شوق، مجھے گمراہ نہ کر، شورش کے لیے اسباب نہیں
امید کہ اجڑے گلشن میں اک پھول بھی اب شاداب نہیں
اب عشق کا چہرہ کیا دیکھوں، اے حسن، ترے آئینے میں
احساس کی آنکھیں دھندلی ہیں، امید کے رخ پر آب نہیں
اب دل کا سفینہ کیا ابھرے، طوفاں کی ہوائیں ساکن ہیں
اب بحر سے کشتی کیا کھیلے، موجوں میں کوئی گرداب نہیں
پھر جوش فسردہ خاطر ہے، اے عہدِ تمنا واپس آ
آشا لگیں کھائے جاتی ہیں، نمکیں کی دل کو تاب نہیں

سنہ ۱۹۲۲ء

دیر سے منتظر ہوں میں، بیٹھ نہ یوں حجاب میں
تاروں کی چھاؤں ہے، در آ میرے دلِ خراب میں

کس سے کہوں میں داستاں طولِ شبِ فراق کی
جاگ رہا ہوں ایک میں، سارا جہاں ہے خواب میں

اس سے ڈرو وہ فتنۂ بزمِ حیات ہے جسے
نیم شب میں تاب ہے نہ ہو عشق نہ ہو حجاب میں

عرش سے آئی یہ صدا بخش دیئے ترے گناہ!
یاد کیا کسی کو یوں کل شبِ ماہتاب میں!

یوں تو حریمِ ناز میں کتنے ہی دل ہوئے نخچیر
حکمِ شکستگی ہوا میرے ہی دل کے باب میں

مضطر و بے قرار ہوں جوش وہ خود مرے لیے
کاش اک ایسی رو بھی ہو دہر کے انقلاب میں

سنہ ۱۹۲۱ء

زمانے کا خدا حافظ کہ جتنے دل میں چھالے ہیں
وہ اب الفاظ بن کر میرے لب تک آنے والے ہیں

کہیں آبادی و صحرا میں جی اپنا نہیں لگتا!
بتا اے وحشتِ دل! ہم کہاں کے رہنے والے ہیں

بگولے اٹھ رہے ہیں، دیدۂ حیراں، نظارہ کر
نہیں معلوم ان میں کس قدر ناز کے پالے ہیں

ٹھہر، بنیاد ہے انسانیت کی صبر دیگیں پر! !
یہ وہ کہتا ہے جس نے زلزلے روح نہیں دائیں

۱۹۲۱ء

ظالم! یہ خموشی بے جا ہے، اقرار نہیں، انکار تو ہو!
اک آہ تو نکلے توڑ کے دل، نغمے نہ سہی، جھنکار تو ہو
ہر سانس میں صد ہا نغمے ہیں، ہر ذرے میں لاکھوں جلوے ہیں
جاں محو رموزِ ساز تو ہو۔ دل جلوہ گہِ انوار تو ہو!
شاخوں کی لچک ہر فصل میں ہے، ساقی کی جھلک ہر رنگ میں ہے
ساغر کی کھنک ہر ظرف میں ہے، مخمور تو ہو، سرشار تو ہو!
کیونکر نہ شبِ مہ روشن ہو، کیوں صبح نہ دامن چاک کرے
کچھ وصفِ رموزِ حسن تو ہو، کچھ مدحِ جمالِ یار تو ہو!
سینے میں خطائیں مضطر ہیں، انعام کا وہ اقرار کریں
منصور ہزاروں اب بھی ہیں، اے جوش صلے میں دار تو ہو

۱۹۲۲ء

نور رگوں میں دوڑ جائے، پردۂ دل جلا تو دو
دیکھنا رقص بھر ہرا، پہلے نقاب اٹھا تو دو
رنگ ہے زرد کیوں مرا حال ہے بگڑ کس لئے
ہو جو بڑے اداشناس اس کا سبب بتا تو دو

میرے مکاں میں تم مکین، میں ہوں مکاں سے بیخبر
ڈھونڈ ہی لونگا میں تمہیں، مجھ کو مرا پتا تو دو

ہو، کہ نہ ہو مجھے سکوں، یہ تو خدا کو علم ہے
نزع میں آ کے سامنے ناز سے مسکرا تو دو

لطف نہیں، جفا سہی، زیست نہیں، قضا سہی
غمزۂ ناز و ادا سہی، عشق کا کچھ صلا تو دو!

تم کو غرور ہے ناز ہے، تم ہو تغافل آشنا
اچھا اگر یہ بات ہے، دل سے مجھے بھلا تو دو

اس سے نہیں غرض نہیں، پھلنے لگے، کہ جل اٹھے
نخلِ حیاتِ جوش پر برقِ نظر گرا تو دو

۱۹۲۶ء

اس بات کی نہیں ہے کوئی انتہا، نہ پوچھ
اے مدعائے خلق، مرا مدعا، نہ پوچھ

کیا کہہ کے پھول بنتی ہیں کلیاں گلاب کی
یہ راز مجھ سے بلبلِ شیریں نوا، نہ پوچھ

جتنے گداگر تھے، کب کے گزر چکے
اب کیوں بچھائے بیٹھے ہیں ہم بوریا، نہ پوچھ

بینشِ نظر ہے پست و بلند رہِ جنوں!
ہم بے خودوں سے قصۂ ارض و سما، نہ پوچھ!

سنبل سے واسطہ، نہ چمن سے مناسبت
اس زلفِ مشکبار کا حال، اے صبا نہ پوچھ

صد محفلِ نشاط ہے، اک شعرِ دل نشیں
اس بربطِ سخن میں ہے کس کی صدا، نہ پوچھ

کر رحم میرے جیب دگریباں پہ ہم نفس
چلتی ہے کوئے یار میں کیونکر ہوا، نہ پوچھ

رہنا نہیں ہے دہر میں جب کوئی آسرا
اس وقت آدمی پہ گزرتی ہے کیا، نہ پوچھ

ہر سانس بس ہے چشمۂ حیواں و سلسبیل
پھر بھی میں تشنہ کام ہوں یہ ماجرا نہ پوچھ

بندہ ترے وجود کا منکر نہیں، مگر
دنیا نے کیا دیئے ہیں سبق، اے خدا نہ پوچھ

کیوں جوشؔ، رازِ دوست کی کرتا ہے جستجو
کہہ دو کوئی کہ شاہ کا حال اے گدا، نہ پوچھ

سنہ ۱۹۲۶ء

غرورِ اہل زمانہ سے گیر و دار، نہ پوچھ
دماغِ کبرِ گدایانِ کوئے یار، نہ پوچھ

بساطِ عالمِ امکاں الٹ نہ جائے کہیں
نہ پوچھ، بہرِ خدا شرحِ حسنِ یار، نہ پوچھ

ٹپکنے لگتے ہیں کیوں اشکِ خندۂ گل سے؟
یہ راز ددست ہے اے نکہتِ بہار، نہ پوچھ

ہوا غروب کی، ساحل پہ جب سسکتی ہے
دلِ حزیں میں محبت کا خلفشار، نہ پوچھ

عذابِ قبر پہ ہنستا ہوں، مختصر یہ ہے
کشاکشِ غمِ شبہائے انتظار نہ پوچھ

سوائے حسن، اٹھاتا نہیں کسی کا بھی ناز
نزاکتِ دلِ اربابِ انکسار، نہ پوچھ

۱۹۲۹ء

دل پہ وہ زخم کھائے ہیں کہ نہ پوچھ
لطف بھی وہ اٹھائے ہیں کہ نہ پوچھ[۱]

ان کی رفتار نے زمانے میں
ایسے فتنے جگائے ہیں کہ نہ پوچھ

میرے سینے میں ذوقِ تمکیں نے
وہ تلاطم مچائے ہیں کہ نہ پوچھ

عشق کی بے خودی کے عالم میں
ہم نے وہ بھید پائے ہیں کہ نہ پوچھ

صرف اک حسرتِ تبسّم میں
اتنے آنسو بہائے ہیں کہ نہ پوچھ

حسنِ کافر نے اپنے قدموں پر
اتنے آنسو مومن جھکائے ہیں کہ نہ پوچھ

ہم نے آرام کی تمنّا میں!
اتنے صدمے اٹھائے ہیں کہ نہ پوچھ

جوشؔ ان انکھڑیوں کی بجلی نے
اتنے خرمن جلائے ہیں کہ نہ پوچھ

---

[۱] اس شعر کے کہنے کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ اس کا دوسرا مصرع داغؔ کے ایک مصرعے کے قریب قریب ہے۔ مگر شعر کہتے وقت چونکہ مجھے اسکا علم نہ تھا۔ اسلئے اسے باقی رہنے دیا گیا

سنہ ۱۹۲۱ء

آزمانا اگر ہے تیر نگاہ !
یہ جگر ہے، یہ دل ہے بسم اللہ

خون رو، اے دلِ تہی پہلو
یہ کنارِ شفق میں جلوۂ ماہ !

فتنۂ خلق، تری زلف دراز
محشرِ ناز، تیری چشمِ سیاہ !

ہم نشیں! تو محال کہتا تھا
دیکھو، کرتے ہیں اسطرح سے نباہ

بس یہ مقصود ہے دو عالم سے
تیرا جلوہ ہو اور میری نگاہ !

کچھ تو فرمائیے پئے تسکیں ہے؛
یوں نہ دامن چھڑائیے للہ

ہجر ہے اور میں بقیدِ حیات
بخش دے اے خدا یہ میرا گناہ

لطف کی اک نگاہ، اے جاناں
جوشش ہے تیرا بندۂ درگاہ

سنہ ۱۹۲۶ء

نگاہ کرم سے حالت ہو دل کی اور تباہ
ترا یہی ہے ارادہ اگر تو بسم اللہ

غضب ہے عارضِ رنگیں پہ چاندنی کی بہار
لبوں پہ کھیل رہا ہے تبسم شبِ ماہ

سرہانے مجھ کو جو دیکھا تو آنکھ کھلتے ہی
وہ مسکرائے جبیں سے ہٹا کے زلفِ سیاہ

نہ کیوں ہو طاعتِ بے روح بلند اے شیخ!
اگر خلوص کی بنیاد پر ہے کوئی گناہ

اُٹھائی یار نے کیوں قیدِ "سمت" و شرطِ جہت
کہیں ٹھہر نہیں سکتی اب اہلِ دل کی نگاہ

جحیم و خلد، کسی کی بھی کچھ نہیں چلتی؟!
عطا کیا ہے بشر کو یہ کس نے ذوقِ گناہ

پرکھتے کاش وہ رہرو کے ذوقِ منزل کو
سمجھ رہے ہیں جو گم کردہ راہ کو "گمراہ"

نہ کھا فریبِ سخن، خواجۂ بزرگ نہاد!
کہ جوشؔ اصل میں ہے ایک رندِ نامہ سیاہ

سنہ ۱۹۲۶ء

نہیں شراب، تو ہنگامۂ بہار نہ دیکھ
جو دل میں تاب نہ ہو آبروئے یار نہ دیکھ

خدا کو مان، یہ گل گشتِ ستم قاتل ہے
مفارقت میں سوئے ماہِ جوئبار نہ دیکھ

سحر، نشاط سے خالی رہے گا آخر تک
چلا ہے گھر سے تو مڑ مڑ کے بار بار نہ دیکھ

ہزار دے کوئی تجھ کو فریبِ آزادی
نگاہِ جبر پہ رکھ سوئے اختیار نہ دیکھ

جو اک بار نہ دیکھیں تری طرف زردار
تجھے خدا کی قسم تو ہزار بار نہ دیکھ

محلِ شرم ہے اے خواجہ! وقتِ بذل و سخا
سوئے نگاہِ گدایانِ شرمسار نہ دیکھ

اگر بہار کے بے خوف لوٹنا ہیں مزے
اٹھا کے دفترِ مستقبلِ بہار نہ دیکھ

اگر حیات کی تعمیر ہے تجھے منظور
نکل کے شہر سے ٹوٹے ہوئے مزار نہ دیکھ

سنہ ۱۹۱۷ء

اے ہم نشیں! یہ قصۂ دہشت فزا نہ پوچھ
دل کس طرح بنا دلِ بے مدعا نہ پوچھ

غارت گروں کی سستیِ پیماں دلا نہ یاد!
سنگیں دلوں کے وعدۂ صبر آزما نہ پوچھ!

لب ہائے ناز کے سخنِ ناسزا نہ پوچھ
چشمِ سیاہ کے ستمِ ناروا نہ پوچھ

قصہ ہے درد ناک دلِ داغ داغ کا!
کیونکر یہ "ماہتاب بنا ہے" سہا؟ نہ پوچھ

طے کر چکا ہوں عشق کی جس راہِ صعب کو
اس راہ کی کشاکشِ بیم و رجا نہ پوچھ

اب تک وہ دل میں آگ بھری ہے کہ الاماں
کس طور سے یہ خاک بنی کیمیا؟ نہ پوچھ

پہلو سے اپنے جوش کو تاروں کی چھاؤں میں
آتی ہے کس نگار کی آوازِ پا؟ نہ پوچھ

سنہ ۱۹۲۱ء

جاں بلب ہوں فراق کے مارے — چار دن کی ہے زندگی پیارے
اے مرے وعدہ بھولنے والے — ڈوبنے کے قریب ہیں تارے

جوش سے کل جو نام اک پوچھا
ہو گیا زرد شرم کے مارے

سنہ ۱۹۲۲ء

دل کا رونا ہے دل کا ماتم ہے
اب تو ہر سانس نوحۂ غم ہے

میرا صدموں میں مسکرا دینا
بدتر از صد ہزار ماتم ہے

دیکھو، وہ دل نہ توڑ دو ظالم!
راز کونین کا جو محرم ہے

یاد ان کی بہت نہیں آتی
شاید اب دل کی زندگی کم ہے

خونِ دل کی ہر اک بوند میں جوش
وسعتِ عرصۂ دو عالم ہے

شاہد مے سے آشنائی ہے[1]
اپنی مشہور پارسائی ہے

حسن کو رام کر کے چھوڑوں گا
مجھ سے دل نے یہ قسم کھائی ہے

آپ سے، ہم سے، رنج ہی کیسا
مسکرا دیجئے، صفائی ہے

آئی عاشق میں شانِ محبوبی
یعنی اب عشق انتہائی ہے

حد ہے، اپنی طرف نہیں میں بھی
اور ان کی طرف خدائی ہے

فقط اک جام دستِ مہ وشاں سنہ ۱۹۲۷ء

فقط اک جام دستِ مہ وشاں سے
فنر دل ہے نہ دولت کون و مکاں سے

خدائی خود مجھے آواز دے گی
کسے امید تھی عشق بتاں سے

[1] کسی نے کہا تھا یہ مطلع حسرت موہانی کے کسی شعر سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن مطلع کہتے وقت میرے ذہن میں حسرت کا وہ شعر نہ تھا

خدا کے فضل سے ہوں وہ بلا نوش
سبک ہوتا نہیں رطلِ گراں سے

نہ پوچھو کیف کے عالم میں کیا کیا
الجھتا ہوں زمین و آسماں سے

کلی بن کر نہ اتنا ناز فرما!
کوئی کہہ دے یہ خاکِ بوستاں سے

نقاب اٹھتی نہیں چہرے سے ان کی
مجھے اٹھنا پڑے گا درمیاں سے

مجھے خود ڈھونڈتے پھرتے تھے جلوے
وہ دن اب ڈھونڈ کر لاؤں کہاں سے

وہ اک پل جو ترے پہلو میں گزرے
گراں قیمت ہے عمرِ جاوداں سے

زمیں ہے رقص میں، گردش میں افلاک
مرے دورِ شرابِ ارغواں سے

مری عصیاں کی راتیں ہیں منور
چراغِ محفلِ روحانیاں سے

قیامت تھی خدا کی بے نیازی
بدلہ لینا پڑا عشقِ بتاں سے

اتر آئے، کہو خود ہی زمیں پر
بلاتا ہے مجھے کیوں آسماں سے

پتا منزل کا ہم کو تو ملا جوشش
بغاوت کر کے میرِ کارواں سے

سنہ ۱۹۲۱ء

کر چکا سیر، اصل مرکز پر اب آنا چاہیے
مجھ کو اپنے دل میں اک دنیا بسانا چاہیے

رسمِ عالم پر نہ جا، دیکھ اپنی افتادِ مزاج
دہر کو اپنی روش پر کھینچ لانا چاہیے

کھیل سمجھا کیا آفتاب رازِ ہستی کا سراغ
ذرے ذرے کے جگر میں ڈوب جانا چاہیے

کچھ سنا، کیا کہہ رہے ہیں نکتہ سنجانِ حیات
جس قدر ہو دل کشی، رنگینی بڑھانا چاہیے

جلوۂ خود بیں کے آگے پیش کرتا ہے دماغ
آئینہ ٹوٹے ہوئے دل کا دکھانا چاہیئے

اس سے تیرے حسن پے پرزہ پہ حرف آئیگا دیکھ
حشر کے دن بھی نہ مجھ کو ہوش آنا چاہیئے

یہ حباب جوئے دل ہے نطق سے اسکو نہ چھیڑ
غم کے افسانے کو آنکھوں سے سنانا چاہیئے

خواہ کتنی ہی مسرت ہو، تبسم ننگ ہے
ہاں جب آنسو کوئی ٹپکے مسکرانا چاہیئے

راہ دل میں خضر کی حاجت نہیں، تنہا نکل
بڑھ کے اپنا ساتھ بھی پھر چھوڑ جانا چاہیئے

اول اول بھول جا ہر شے بجز یاد حبیب!
آخر آخر یاد بھی دل سے بھلانا چاہیئے!

تیرا کہنا ہو گیا، لے ہیں نے آنکھیں پھوڑ لیں
اب تو بزم ناز کا پردہ اٹھانا چاہیئے

کچھ نہ رہ جائے بجز یک شعلۂ عالم فروز
اس طرح اجزائے ہستی کو جلانا چاہیئے

قدم انسان کا راہِ دہر میں تھرا ہی جاتا ہے سنہ ۱۹۲۷ء
چلے کتنا ہی کوئی بچ کے، ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا پھر بھی!
ہجوم کش مکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے

خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں، مگر ناصح!
وہ آتے ہیں تو چہرے پر تغیر آ ہی جاتا ہے

ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بنکر:
مگر جو گھِر کے آتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے

شکایت کیوں اسے کہتے ہو؟ یہ فطرت ہے انساں کی
مصیبت میں خیالِ عیشِ رفتہ آ ہی جاتا ہے

شگوفوں پر بھی آتی ہیں بلائیں، یوں تو کہنے کو
مگر جو پھول بن جاتا ہے وہ کمھلا ہی جاتا ہے

سمجھتی ہیں مآلِ گل، مگر کیا زورِ فطرت ہے
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

۱۹۲۴ء

باتوں میں سرد مہری، آنکھوں میں مہربانی
کس نے سکھائے ہیں یہ آئینِ دلستانی

ہر اک نفس کو میرے صد موجِ برق دے کر
بخشی ہے تو نے دل کے خرمن کو پاسبانی

رکھی ہے اے سبک سر! معمارِ زندگی نے
دل کی شکستگی پر بنیادِ شادمانی

پھر زخمِ نو کا شاید کرنا ہے خیر مقدم
دل سے گزر رہی ہے اک موجِ کامرانی

فطرت، مآلِ سعیِ باطل پہ ہنس رہی ہے

بھنویں تنی ہوئی ہیں ساون کے بادلوں کی
اللہ ری یہ تیری کافر اٹھتی ہوئی جوانی!

پہلو میں تیرے اگر مجھ کو ہوا یہ دھوکا
میں ہوں الوہیت کا اک جزو غیر فانی

اے جوش، ہند اب تک محروم رنگ و بو ہے
صدیوں ابھی نہ ہوگی شاعر کی قدر دانی

[illegible]

انشائے راز عشق کا ساماں کئے ہوئے
پھر آگئے وہ بال پریشاں کئے ہوئے

پھر قشقہ برہمن کوئی نکلا ہے دیر سے
آہنگ آزمائش ایماں کئے ہوئے

پھر بڑھ رہا ہے میری طرف مطرب جنوں
صحرا کو اپنے ساتھ غزلخواں کئے ہوئے

پھر مست چل رہی ہے ہوا کوہ و دشت میں
ہر شے کو اپنی رو میں گلستاں کئے ہوئے

خنجر بکف بڑھا ہے مری سمت پھر جمال
کہنی تک اپنے ہاتھوں کو عریاں کئے ہوئے

پھر آ رہے ہیں وہ رخ سے اٹھائے ہوئے نقاب
[illegible] اک نگاہ میں پنہاں کئے ہوئے

پھر اس نے آ کے کفر کا اقرار لے لیا
مدت ہوئی تھی دل کو مسلماں کئے ہوئے

پھر آئے ہیں وہ جوش ہوئے تجربان عشق
شعلے کی طرح تیغ کو عریاں کیے ہوئے

سنہ ۱۹۲۵ء

کہیں تو کون لائے گا کہ فیضِ چشمِ گریاں سے
شرر کے پھول ٹنے لگتے ہیں چشمے روحِ انساں سے
دکھاؤں اپنی فطرت کے نوادر کس توقع پر
کہ اس بازار میں راضی ہیں گاہک جنسِ ارزاں سے
صحائف میرے سر آنکھوں پہ، لیکن واقعہ یہ ہے
خدا کو میں نے پہچانا ہے نورِ صبحِ خنداں سے
الٰہی! یہ جواں چشم و چراغِ بزمِ عالم ہو!
بصارت چھین کر جو لے چلا ہے پیرِ کنعاں سے
ربابِ زندگی میں جس کے چھو جانے سے لرزش ہے
وہ ناخن کھینچتا ہے ہر نفس میری رگِ جاں سے
لکھائی "طرح" میں محدود کر کے پھر غزل مجھ سے، خدا لے جوش مجھ سے شاعرانِ سست بنیاں سے۔

سنہ ۱۹۲۱ء

کس قدر آئینہ تائید ہر تردید ہے
شرک بھی دیکھا تو اک بھٹکی ہوئی توحید ہے
دے اگر جنبش کبھی عہدِ وفا کے واسطے
تیرے ہونٹوں میں نہاں میرا ہلالِ عید ہے

کس قدر پختہ ہے تیرا وعدۂ دیدار بھی
ہر طلوعِ صبح تیرے عہد کی تجدید ہے

سوچیے کیا چیز ہوگی اس کی صبحِ آرزو !
جس کی شامِ نامرادی، منبعِ صد امید ہے

شہدیؔ[1] مرنے میں پنہاں ہے عجب کیفِ جنوں
ایسے دیوانے سے ملنا جوشؔ اپنی عید ہے

گردن میں ہیں وہ باہیں گردش میں ہیں پیمانے
کیا دین ہے، کیا دنیا، شاعر کی بلا جانے

سن لیجیے فرصت ہے، پھر کیا ہو خدا جانے
سب سے ہیں مرے دل میں بیتاب کچھ افسانے

کچھ دیکھ سکیں شاید آبادیاں شہروں کی
اے راہرو! ٹھہرو، ٹھہرو، کچھ کہتے ہیں ویرانے

مطرب وہ اٹھے پردے، ساقی، وہ کھلے عقدے
ہاں یوں ہی دما دم دے پیمانوں پہ پیمانے

ہم عشق سے کیا واقف، واقف ہیں تو صرف اتنا
آغاز ہلاکت ہے، انجام خدا جانے

جو غنچہ و شبنم نے کل رات کے ہونٹوں پر
اب صبح کے کانوں پر نشتر ہیں وہ افسانے

[1] احسن مرزا احمد حسین شہرؔ شہدی لکھنوی، جو مصنف کے بہترین احباب میں سے تھے

اسے تو تنش الجھتا ہے کیوں شیخ نیک سرے
یہ عشق کو کیا سمجھے، یہ حسن کو کیا جانے!

سنہ ۱۹۲۶ء

کیا کہیں وہ رازِ پنہانی، جو اپنے دل میں ہے!!
آہ اس غنچے کی عریانی، جو اپنے دل میں ہے
کس کو سمجھائیں، کہ ماخذ ہے جہاں سوز کا
یہ ہجومِ شعلہ سامانی۔ جو اپنے دل میں ہے
ڈالتی ہے پردے حکمت پر حقارت سے نگاہ
رازِ عالم پر یہ حیرانی جو اپنے دل میں ہے
شمع یہ جب بلبل کو پروانہ کا دیتی ہے درس
یہ تصور کی پرافشانی، جو اپنے دل میں ہے
کون مانے گا، کہ ہے افسردہ مژگاں ترا
یہ مسرت کی فراوانی، جو اپنے دل میں ہے

سنہ ۱۹۲۷ء

محلِ شکوہ نہیں ہے جہاں کی بوالعجبی!
کہاں تک اے دلِ ناداں! یہ مشقِ بے ادبی
نشاطِ ہمدگر ہے انتشار کہ تو ازل پر!
ہنر کا فن ہے بیک سکوتِ نیم شبی
ازل سے نور سے ظلمت ہے نور کی بنیاد
کہ خاک تیرہ ہے صناعِ شب شرر طلبی!

تجھے خبر بھی ہے نادان کی مثال روغن ہے
چراغِ منطقوی کو ہوا ہے بو نہیں !

۱۹۲۵ء

یہ چھیڑ شاعر! رباب رنگیں، یہ بزم ابھی نکتہ داں نہیں ہے
تری نواسنجیوں کے شایاں فضائے ہندوستاں نہیں ہے
تری سماعت، نگارِ فطرت کے لحن کی رازداں نہیں ہے
دگرنہ ذرہ ہے ایسا کہ جس کے منہ میں زباں نہیں ہے
زباں پہ ہیں صوفیوں کی یارب! یہ کیسی بے مغز اصطلاحیں
زمیں کے پردے پہ ماسوا کا کہیں بھی نام و نشاں نہیں ہے
اگرچہ پامال ہیں یہ محسوس، مگر سخن ہے بلند، ہمدم
نہ دل میں لانا گمانِ پستی، مری، یہ زمیں، وہ آسماں نہیں ہے
ضمیرِ فطرت میں پرفشاں ہے چمن کی ترتیبِ نو کا ارماں!
خزاں جسے تو سمجھ رہا ہے وہ درحقیقت خزاں نہیں ہے
حریمِ انوارِ سرمدی ہے ہر ایک ذرہ بہ رتبہ کعبہ
مرا یہ عینی مشاہدہ ہے، فریبِ وہم و گماں نہیں ہے
ہر ایک کانٹے پہ سرخ کرنیں، ہر اک کلی میں چراغ روشن
خیال میں مسکرانے والے! ترا تبسم کہاں نہیں ہے
فلک سے ہنگامِ شعرگوئی، صدائیں پیہم یہ آ رہی ہے
کہ آج اے جوشِ نکتہ پرور! ترا سا جادو بیاں نہیں ہے

۱۹۲۶ء

ٹھہر، کہ عبرت کے کارخانے ہر ایک ذرے میں ہیں یہاں کے
نہیں یہ پتھر ہیں، نشانِ پا ہیں حیاتِ ثانی کے کارواں کے
ہیں اس کی گہری نظر کے صدقے، ہیں اسکے ذوقِ طلب کے قرباں
تری تجلی جو دیکھتا ہے دھوئیں میں اس تیرہ خاکداں کے
چمکتے ہیں شب کو ماہ و اختر، جھلکتا ہے صبح شاہِ خاور!
پرستش ان کی کروں نہ کیونکر؟ نشاں ہیں یہ میرے بے نشاں کے
نہ پوچھ راحت پرست! کیونکر کھلا ہے یہ بھید میرے دل پر؟
کہ اشک بہنے سے ٹوٹتے ہیں طلسم نیرنگیٔ جہاں کے
یہ رازِ حق ہے، نہ کھل سکے گا کبھی ترے کبرِ خود نما پر!
کہ خاکِ افتادگی کے اندر دریچے کھلتے ہیں آسماں کے
نوائے بلبل، سرودِ قمری، ہیں سر دھنوں کیوں نہ خوش ان پہ
کہ ہیں یہ کچھ یادگار فقرے، کسی کی شیرینیٔ بیاں کے:

۱۹۲۳ء

رسمِ خرد سے ارتباط، روح کو وجہِ ننگ ہے
پائے جنوں اُدھر نہ جا دشتِ شعور تنگ ہے
اس کا جمال چھوڑ کر اس سے بہشت مانگنا
تیری نظر میں ہو ہنر میرے لئے تو ننگ ہے
عشق کا دل اگر درہے، فرطِ جنوں سے بے ادب؛
حسن! مگر خطا معاف، تو بھی تو شوخ و شنگ ہے

بات ہے جوشؔ ایک ہی فرق ہے، حسن و عشق کا
میری جبیں کی خستگی، ان کی جبیں پہ رنگ ہے

۱۹۲۳ء

شکرِ ایزد کہ دل کی بیتابی — بن گئی مایۂ ظفر یابی
وائے قسمت کہ اپنی جنس ہنر — ہیچ ہے باوجود نایابی
پست ہے میرے سازِ وحشت سے — نغمۂ بوعلی و فارابی
تھک چکی ہیں رسائیاں کیا کیا — بل بے انساں کا ذوقِ سر

یاد آتا ہے آگرہ اے جوشؔ
ہائے وہ چاندنی، وہ مہتابی

۱۹۲۳ء

دلوں کو شامِ الم ہنسا دے، شبوں کو محرومِ خواب کر دے
تجھے قسم حسنِ زرد سے! مجھ کو رہینِ صد پیچ و تاب کر دے
نقاب اٹھا روئے جاناں سے، دلوں کی دنیا میں ہو اجالا
اداس ذروں پہ مسکرا کر، نگاہ کر، آفتاب کر دے
مجھے حقیقت سے آشنا کر، دلوں کو تسکین دینے والے
ہر ایک کانٹے کو زندگی کے، مری نظر میں گلاب کر دے
کھلے ہوئے ہیں فلک پہ تارے، تجھے قسم ان کی سادگی کی
مری شبِ تار کو بھی یا رب! کبھی شبِ ماہتاب کر دے
مقام طے ہو رہے ہیں میرے، ہٹا نہ آئینے سے نگاہیں
مجھی پہ صرف ہو سنورنے والے، تمام زورِ شباب کر دے

حریمِ جاناں میں باریابی کی جوشؔ اگر تجھ کو آرزو ہے
جگا دے غفلت سے بیخودی کو، خرد کو مصروفِ خواب کر دے

سنہ ۱۹۳۴ء

جلا کے میری نظر کا پردہ، ہٹا دی رخ سے نقاب تو نے
چراغ اٹھا کر مرے شبستاں میں رکھ دیا آفتاب تو نے

فلک نظر سے تڑپ رہا ہے، زمیں عشووں سے ہل رہی ہے
کہاں سے پایا ہے او ستمگر! یہ مست و کافر شباب تو نے

نسیم اوراق الٹ رہی ہے، نجوم مشعل دکھا رہے ہیں
افق کی سرخی میں پیش کی ہے، سحر کی زریں کتاب تو نے

میں اپنے سینے میں تجھ کو رکھ لوں، ادھر تو آ اے سحابِ رنگیں
زمیں پہ ٹپکائیں رس کی بوندیں، فلک پہ چھڑکی شراب تو نے

زمیں کی جانب نظر جو [illegible] کل ایک شاعر یہ کہہ رہا تھا
ہر ایک ذرے کو مسکرا کر بنا دیا آفتاب تو نے

جو باخبر تھے، وہ مسکرائے، جو بےخبر تھے وہ کچھ نہ سمجھے
اٹھا کے بیگانہ وار آنکھیں، کیا وہ مجھ سے خطاب تو نے

ترے نثار اے نگاہِ ساقی! ترے تصور میں کیوں نہ جھوموں
کہ اپنے پرتو کو میرے دل میں بنا دیا ہے شراب تو نے

پلٹ گئیں اشک بن کے نظریں، گرا دیا جیسے ہی تو نے پردہ
برس پڑیں سینکڑوں نگاہیں، ذرا جو الٹی نقاب تو نے

نہ ہوگا [illegible] سا بھی لاابالی، خدا کی رحمت ہو جوشؔ تجھ پر!

سحر کو کیا کیا مژدے نہیں ہیں، کبھی نہ دیکھا یہ خواب تو نے

۱۹۲۵ء

شب، قصور نے یہ بخشا اوج روحانی مجھے
اپنے قدموں پر ملی گردوں کی پیشانی مجھے

جا کے گوشے میں کسی صحرا کے رو دیتا ہوں میں
یاد آتی ہے جو اپنے گھر کی ویرانی مجھے

آسمانوں کی بلندی دیکھتی ہے راستہ،
خاک سے اٹھنے نہیں دیتی تن آسانی مجھے

بارغ نے لکھوائی مجھ سے طرح دیگر یہ غزل
کچھ پشیمانی نہیں ہے، کچھ پشیمانی مجھے!

اے چٹکتی صبح کی بیدرد کلیو! رحم، رحم
یاد دلواتی ہو یہ کس کی خوش الحانی مجھے

دفتر عالم کا راز اک سطر میں سمجھا دیا!
جادۂ عرفاں ہے تیری چین پیشانی مجھے

وہ مقام اتصال آیا ہے اے یاد حبیب
سب سے پہلے اب تری کرنا ہے قربانی مجھے

لکھنؤ کیا چھٹ گیا، اے جوشؔ دنیا چھٹ گئی
اب کہاں ممکن وہ سامان غزلخوانی مجھے

ــــــــــ

ﮯ میر کاظم علی صاحب بارغ جو میرے ہونہار دوست حضرت اختر کے والد ہیں

میرے حواس سلب کیے، یار کی چشمِ مست نے
فتح کا تاج رکھ دیا سر پہ مرے شکست نے

طعنۂ خود سری دیا عشقِ جنوں پرست نے
راہِ وفا میں کھو دیا فکرِ بلند و پست نے

سر پہ ترے رہیں سدا پھولوں کا تاج فصلِ گل
روح کو مست کر دیا تیری ہوائے مست نے

نظمِ عبودیت پڑھی میں نے کچھ ایسے لحن سے
ہنس کے رباب اٹھا لیا نغمہ زنِ الست نے

آ کے ہماری آنکھ میں اشک نہ کیوں تھمے رہیں
درس دیا ہے آپ کی چشمِ حیا پرست نے

جا کے نسیمِ جاں نثار! کہنا یہ بزمِ حسن میں
بھیجا ہے تحفۂ سلام جوششِ سحر پرست نے

۱۹۲۳ء

۱۹۲۷ء

اے دورِ ہوس پرور، اے عہدِ ریا کاری
کیا شرع میں تیری بھی جائز نہیں مے خواری

اندھوں کو دکھا جلوے، بہروں کو سنا نغمے
قدرت نے مرے حق میں یہ حکم کیا جاری

کیا جبر ہے، کیا مد ہے، کیا دورِ تسلسل ہے
دشواری و آسانی، آسانی و دشواری

اے عشقِ وفا! کب تک اپنے دم و صبح گرم تا کے؟
یہ صبح کی فریادیں، راتوں کی یہ بیداری

پردہ اب اٹھایا ہے سلمائے محبت نے!
کاندھے پہ مرے رکھ دو تابوت ہوس کاری

معبود طلب کر لے، قدرت کے مناظر کو
کافر ہوں، اگر خود سے کی ہو کبھی مے خواری

کس حد کی جنوں پرور شرطیں ہیں محبت کی
خاموشی و گویائی، ہشیاری و سرشاری

اے شرمِ گنہ تجھ سے بے کار الجھتا ہے
یارانِ طریقت کا پندارِ نکوکاری!

یہ عیش کی صورت ہے، وہ لطف کا ساماں ہے
اے جوش! کھلونوں کی تا چند خریداری

سنہ ۱۹۲۸ء

نہ جنبش خیرگی مے تماشا کہیں جیسے
بے پردہ یوں ہوئے ہو کہ پردہ کہیں جیسے

اللہ ری خاکساری رندانِ بادہ خوار
رشکِ غرورِ قیصر و کسریٰ کہیں جیسے

بجلی گری وہ دل پہ جگر تک اتر گئی:
اس چرخ ناز سے، قد بالا کہیں جیسے

زلفِ حیات نوعِ بشر میں ہے آج تک
زخم گناہ آدم و حوا کہیں جیسے

کتنی حقیقتوں سے فزوں تر ہے وہ فریب
دل کی زباں میں وعدہ فردا کہیں جیسے

میر القلب ہے جس کا لقب ہے شمیمِ زلف
میری نظر ہے چہرہ زیبا کہیں جیسے

دیکھی ہے اک وصل میں بھی ہوئی وفا
اہلِ جہاں عداوت اعدا کہیں جیسے

لو آ رہا ہے وہ کوئی مست خرام سے — اس چال سے کہ لرزشِ صہبا کہیں جسے
میرے نشاط خانۂ امروز میں نہیں — وہ بندگی کہ خطرۂ فردا کہیں جسے
خنجر ہے جوش ہات میں، دامن لہو سے تر
یہ اس کے طور ہیں کہ مسیحا کہیں جسے

سنہ ۱۹۲۶ء

دل تمناؤں سے یوں دور ہوا جاتا ہے — حسن تعظیم پہ مجبور ہوا جاتا ہے
اتنی نزہت پہ بھی نازاں ہے اللہ اللہ — مجھ سے ہر سانس میں وہ دور ہوا جاتا ہے
مائل سجدہ ہوئے جاتے ہیں خوبانِ جہاں
جوشؔ یوں عشق پہ مغرور ہوا جاتا ہے

سنہ ۱۹۲۵ء

کافر بتوں کا کفر کا ساماں تو کیجئے — پہلے گھنیری زلف پریشاں تو کیجئے!
اس نازِ ہوش کو کہ ہے موسیٰ پہ طعنہ زن — اک دن نقاب الٹ کے پشیماں تو کیجئے
عشاق بندگانِ خدا ہیں، خدا نہیں — تھوڑا سا نرخ حسن کو ارزاں تو کیجئے
قدرت کو خود ہے حسن کے الفاظ کا لحاظ — القا بھی ہو ہی جائیگا پیماں تو کیجئے
تا چند رسم جامہ دری کی حکایتیں؟ — تکلیف یک تبسم پنہاں تو کیجئے
یوں سر نہ ہوگی جوشؔ کبھی عشق کی مہم
دل کو خرد سے دست و گریباں تو کیجئے

سنہ ۱۸۲۹ء

فقیہہ شہر مناسب نہیں یہ جلوہ گری — کہ ادعا سے خبر ہے کمال بے خبری

علاج دل کا کروں کیا، اگرچہ واقف ہوں | کہ برقِ خرمنِ ہستی ہے ذوقِ دیدہ وری
رفیق جام اٹھا، ذکرِ مدعی ہو موقوف | کہ ہے فرشتۂ بغض و دماغِ کینہ وری
فغاں کہ فکر کو میری ملا ہے وہ بازار | جہاں متاعِ ہنر سے گراں ہے بے ہنری
تجھے جراحتِ دل کی ہے فکر کیوں اتنی | کہ خود ہے رقت کی فطرت میں ذوقِ بخیہ گری
ہزار نغمۂ رنگین و نفسِ بادِ سحر ادا | فدائے نالۂ شبگیر و گریۂ سحری

سکوتِ شب میں پہنچتا ہے آ دل وہاں اے جوش
کہ چھوٹتی ہے جہاں نبض آدمی و پری!

۱۹۲۵ء

حکم تو یہ ہے کہ اک وضع پہ ہو نظمِ جہاں | چاہتے یہ ہو کہ آویزشِ اضداد رہے
داد دے وعظِ مشیت ہیں یہ جس کا خیال | ہائے وہ رات جو ہنگامِ سحر یاد رہے
دعوتِ برق ہے تعمیرِ نشیمن کا خیال | غمِ جاناں کا تقاضا ہے کہ دل شاد رہے

یہ بغاوت ہے جنوں سے کہ رہے پاسِ خرد
یہ ہے توہینِ خدائی کہ خدا یاد رہے

۱۹۲۶ء

خود اپنی زندگی سے وحشت سی ہو گئی ہے
ہماری کچھ ایسی دل پہ غیرت سی ہو گئی ہے

ذوقِ طرب سے دل کو ہونے لگی ہے وحشت
کچھ ایسی غم کی جانب رغبت سی ہو گئی ہے

سینے پہ میرے جب سے رکھا ہے ہاتھ تم نے!
کچھ اور درد دل میں شدت سی ہو گئی ہے

ممکن نہیں کہ بل کھر رشما ہی مسکرا دو !
تم کو تو جیسے ہم سے نفرت سی ہو گئی ہے

اب تو ہے کچھ دنوں سے یوں دل بجھا بجھا سا
دونوں جہاں سے گویا فرصت سی ہو گئی ہے

وہ اب کہاں ہیں، لیکن اے ہمنشیں یہاں تو
مڑ مڑ کے دیکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے

اے جوشؔ رفتہ رفتہ شاید ہمارے دل سے
ذوقِ فسردگی کو الفت سی ہو گئی ہے

سنہ ۱۹۲۶ء

جب تک آنکھوں میں سوزِ صہبا تھی
ذرے ذرے میں ایک دنیا تھی

بارے اب ظلم پر تو مائل ہو!
ورنہ تم سے امید ہی کیا تھی

رحم، اس عہد کے تصدق میں
جب نہیں خود مری تمنا تھی

ہائے کس وقت یہ ہوا معلوم
کہ تری آرزو نہ کرنا تھی

سنہ ۱۹۲۶ء

قسم ہے آپ کے ہر روز روٹھ جانے کی
کہ اب ہوس ہے اجل کو گلے لگانے کی

وہاں سے ہے مری ہمت کی ابتدا واللہ
جو انتہا ہے ترے صبر آزمانے کی

بھٹکا ہوا ہے میرے آشیاں کا ہر تنکا
فلک کو خو ہے تو بجلیاں گرانے کی

ہزار بار ہوئی گو تاں گل سے دو چار
کلی سے خو نہ گئی پھر بھی مسکرانے کی آ

مرے غرور کے ماتھے پہ آ چلی ہے شکن
بدل رہی ہے تو بدلے ہوا زمانے کی

چراغ دیر و حرم کب کے بجھ گئے اے جوشؔ
ہنوز شمع ہے روشن شراب خانے کی

مژدہ اے رندو کہ سرمستی کا ساماں آگیا
وہ ہوا سنکی وہ یارِ گل بداماں آگیا

خوش ہوا اے پیاسی نہیں وہ بوند یاں پڑنے لگیں
مژدہ اے جوئے تنگ مایہ کہ طوفان آگیا!

بل کے ہاں اک نعرہ، اے رندو کہ وہ کافر جمال
رخ پہ بکھرائے ہوئے زلف پریشاں آگیا

ہاں اٹھو مجرے کو یارو جام چھلکاتے ہوئے
بزم میں وہ صدرِ بزمِ بادہ خواراں آگیا

مل کے ہاں اک سجدۂ شکرانہ اے رندانِ پاک
بوستاں میں وہ الٰہ بادو باراں آگیا!!

بلبلوں کی نغمہ پردازی کا اب کس کو دماغ
بزم نادش میں یار غزلخواں آگیا!

کس لئے اب کیجئے سیرِ گلستاں کی ہوس
حلقۂ جام و سبو میں خود گلستاں آگیا

دیکھئے اب کیوں دریچوں سے خرامِ ابر کو
مے کشوں کے پاس خود ابرِ خراماں آگیا!

عشق رقصاں ہو کہ آپہنچا پیامِ مرگِ نو
جوشؔ! سجدے کر کہ تیرا دشمنِ جاں آگیا

مطلعِ حلقۂ ادراک و نقدِ عالمِ ہوش
فدائے ساقیِ ساغر بدست و زلف بدوش

زمانہ ذوقِ سماعت سے پی رہا ہے شراب
ستارہ ہائے ... افسانۂ چشمِ بادہ فروش

یہ بزمِ نیم شبی ہے یہ وقتِ رامش و رنگ
امامِ شہر اگر ہو اور محتسب، خاموش

پکارتے ہیں تلاطم شراب طانے ہیں
ہجومِ بہار و بتانِ عشوہ فروش

کئے ہوئے ہے زمان و مکاں سے بیگانہ
شمیمِ گل کا تلاطم، صدائے نائے کا خروش

کسی جبیں سے نمایاں نہیں دبائے خرد
کسی نگاہ میں باقی نہیں ملامتِ ہوش

ازل ہی سے یہی بہاریں برس رہی ہیں شراب
مچل رہی ہے غنچوں میں بانگِ نوشا نوش

شرابِ کہنہ و مہتاب و ساقیِ نوخیز
چمن میں آج یہ سب نعمتیں ہیں بادوش بدوش

رگوں میں بادہ، پہلو میں یار، سر پہ قمر
زمیں کنیز ہے آج آسماں حلقہ بگوش

نہ کیوں ہو مطربۂ چرخ گوش بر آوازہ!
بجوش خندہ ہیں کہ سن لے کلام حضرتِ جوشؔ

Page No:-
115

Languages Register

Taskeena Fazil